نسہ دعوۃ الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر : سمیع الحق

جلد نمبر ۴ ، شمارہ نمبر ۶
ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ مارچ ۱۹۶۹ء

اس شمارے میں

★

بدل اشتراک

مغربی پاکستان : سالانہ چھ روپے ، فی پرچہ ۶۰ پیسے۔
مشرقی پاکستان : سالانہ بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے ، فی پرچہ ۷۵ پیسے۔
غیر ممالک : سالانہ ایک پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

نقشِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اخبارات میں خبریں آرہی ہیں کہ عنقریب حکومت ملائشیا کے زیرِ اہتمام بڑے پیمانے پر اسلامی ممالک کی ایک کانفرنس ہورہی ہے جس میں پاکستان کے علاوہ اکثر مسلم ممالک کے مندوبین بھی شریک ہوں گے اس کانفرنس کے ایجنڈے پر بہت سی چیزوں کے علاوہ کئی ایسے امور بھی شامل ہیں جن نے راسخ العقیدہ مسلمانوں اور اسلام کی ابدیت پر یقین رکھنے والے اہلِ علم کو بجا طور پر چونکا کر دیا ہے ـــــ عید الفطر، عید الاضحیٰ اور رمضان المبارک کی ابتدائی اور آخری تاریخوں کا تعین، زکوٰۃ اور صدقۃ الفطر کی وصولی کا طریق کار اور مصارف کا تعین، سود اور بنکاری، تجارت اور کاروبار، عائلی قوانین، شادی اور طلاق، خاندانی منصوبہ بندی قانونِ وراثت اور وصیت، اسلامی نقطہ نظر سے بیت المقدس کا جائزہ اور کئی دیگر مذہبی موضوعات ـــــ پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے اسمبلی میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ایجنڈے کے ان امور کے پیشِ نظر یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کانفرنس کے پس پشت کسی غیر ملکی طاقت کا ہاتھ بھی ہے ـــــ مگر ہمارے لئے ایجنڈے کے یہی موضوعات ہی تو استعمار و استشراق کے اسلام دشمن عزائم کی غمازی کر رہے ہیں۔ عالم اسلام کے ذلت و ادبار کے محرک بیشمار مسائل اور مغربی تہذیب کی پیداوار بیشمار قبائح، بے پردگی، مخلوط تعلیم، سینما، فحاشی، دینی اقدار سے بغاوت، اسلامی علوم سے گریز اور اس قسم کے لاتعداد قابلِ توجہ امور کو چھوڑ کر صرف انہی امور اور مسائل کو زیرِ بحث لانا جو عرصہ سے مستشرقین یورپ اور ان سے متاثر نام نہاد اسلامی سکالروں اور محققین نے ایک خاص نقطہ نگاہ سے مشقِ تحقیق بنائے ہوئے ہیں۔ کیا یہ چیز اس امر کی نشاندہی نہیں کر رہی کہ ملائشیا کی اسلامی کانفرنس کی اسٹیج پر یہ تازہ ڈرامہ کسی خاص مقصد کا آئینہ دار ہے، اسلام ان تمام امور کی شرعی اور قطعی حیثیت کے بارہ میں واضح اور دو ٹوک فیصلہ کر چکا ہے۔ ان میں سے نہ تو عائلی اور معاشرتی قوانین قابلِ تبدل ہیں اور نہ زکوٰۃ کے مقادیر اور مصارف تغیر پذیر ہیں اور نہ نماز روزہ کو اپنی شرعی حیثیت سے گھٹایا یا بڑھایا جاسکتا ہے۔ نہ تو سود اور سودی بنکاری شریعت کی نگاہ

میں قابلِ برداشت ہو سکتی ہے اور نہ اسلام زکوٰۃ اور وراثت جیسے طے شدہ امور میں کسی کو کمی وبیشی کی اجازت دے سکتا ہے۔ بحث ہونی چاہیئے تو یہ کہ تجارت، معاشرت اور تمدن پر مسلط غیر اسلامی طریقِ کار سے گلو خلاصی کی صورت اور اس کا متبادل حل کیا ہے۔ اسلام کے قانونِ وراثت کی پوری رعایت اور نگہداشت کیسے کی جا سکتی ہے۔؟ نہ یہ کہ ہم عصری تقاضوں سے اسلام کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ان مسلّمہ اصول اور مسائل پر ہاتھ صاف کرنے لگیں۔ مغربی اقوام اور ان کے اہلِ علم، علمی ادارے، فاونڈیشن، ریسرچ انسٹی ٹیوشن اور مستشرقین کی شکل میں ایک بہت بڑی مضبوط اور منظم طاقت ابتداء سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ علمی تحقیق، نظریاتی غور وفکر اور تحقیق وریسرچ کے نام سے اسلامی اقدار اور دینی روح سے مسلمانوں کا رشتہ کسی طرح کاٹ دیا جائے۔ اس کا اندازہ یورپ کے اونچے پایہ کے مستشرقین گولڈ، تسہیر، اسمتھ، شاخت اور مارگولیتھ کی "تحقیقات" اور اسلام کے بارہ میں "انکشافات" سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے طرزِ فکر پر سوچنے والے ہمارے ہی ان لوگوں کے پروردہ تلامذہ کے اب تک کے کارنامے اس کے مزید شاہد عدل ہیں، ان لوگوں کو ہمارے ہاں کام کے آدمی اگر مل سکتے ہیں تو فضل الرحمان قسم کے لوگ اور قابلِ امداد معلوم ہوتے ہیں۔ "اسلامی تحقیقات" قسم کے ادارے جنہیں اسمبلی کی ایک رپورٹ کے مطابق لاکھوں روپیہ یورپ کے ایک فائونڈیشن نے علمی امداد کے طور پر دیا۔ یہ فائونڈیشن[1] امریکہ کے رسوائے زمانہ شعبہ جاسوسی سی آئی اے کے زیرِ نگرانی کام کر رہا ہے۔ اسلامی ممالک میں تجدّد اور لادینیت کی راہ ہموار کرنے اور وہاں کے مسلمانوں کے دینی تصلّب کا اندازہ لگانے کیلئے مختلف وقفوں سے اس قسم کے کلوکیم اور کانفرنس منعقد کرائے جاتے ہیں جس کا ایک نمونہ ہمارے ہاں چند سال قبل لاہور کے اسلامی کلوکیم

---

[1] سنا ہے کہ ہمارے "دوست" ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بھی اسی فاؤنڈیشن کے زیرِ سایہ کراچی کے ایک ذیلی ادارہ میں اس وقت مصروفِ کار ہیں، معلوم نہیں یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ سرکاری سطح پر تردید کے باوجود اب تک ماہنامہ "فکر ونظر" کی پرنٹ لائن پر ڈاکٹر صاحب کا نام بحیثیت ناشر دیکھ کر عام تاثر یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا رابطہ اب تک ادارہ تحقیقات سے قائم ہے۔۔۔ اسلامی مشاورتی کونسل ایک اہم ادارہ ہے ڈاکٹر صاحب کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ انہیں اس ادارہ سے الگ کر دیا گیا ہے مگر کیا اس ادارہ میں مشرقی پاکستان سے ابوالہاشم جیسے بددین اور ملحد شخص کو نامزد کر کے ڈاکٹر صاحب کی کمی نہیں پوری کی گئی۔

اور پچھلے سال راولپنڈی کی اسلامی کانفرنس کی شکل میں سامنے آچکا ہے۔ ایسی کانفرنسوں کے غور و فکر کا محور صرف ایک ہی رخ ہوتا ہے، اگر کانفرنس کی عام فضا ان کے لادینی عزائم سے ہم آہنگ ہو جائے تو اس کے مباحثات اور مذاکرات کو خوب اچھالا جاتا ہے اور اگر دو چار نا متعصب، پختہ علم اور راسخ العقیدہ علماء حق کی وجہ سے منتظمین اپنی اغراض خبیثہ میں شکست کھا جائیں تو ایسی مجالس کے تمام زیر بحث امور اور فیصلوں کو پردۂ خفا اور گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ راولپنڈی کی اسلامی کانفرنس اس کی واضح مثال ہے جس کی اسٹینڈنگ کمیٹیوں کی اصل حقیقت اور اس کے اصل محرکات تو تب ظاہر ہوں گے جبکہ اس کے فیصلوں اور بحث و مباحثہ کے پس منظر میں اس میں شرکت کرنے والوں کی علمی اور دینی حیثیت سامنے آ جائے۔ ملائیشیا کی موجودہ سیاسی حیثیت پھر پچھلے دنوں بعض اسلامی امور کے بارہ میں اسکی پارلیمنٹ اور عدالتوں کے غیر اسلامی اندازِ فکر اور عالمی پیمانہ پر زیر بحث مسائل پر ایک ہی انداز میں غور و خوض کی بناء پر یہی خدشہ ہے کہ کہیں یہ کانفرنس بھی اسلام کو لادینی مغرب کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرانے کی ایک سعی نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی ہر سعی بالآخر بے کار اور لاحاصل ہی ثابت ہوگی کہ اس قسم کی کانفرنسیں خواہ کتنی ہی "عظیم اور لامثال" کیوں نہ ہوں، اسلام کی ابدیت اور قطعیت پر ہرگز ہرگز اثر انداز نہیں ہو سکتیں، بلکہ اسلام کی حفاظت کے لئے خداوند کریم کی غیبی امداد کی بناء پر ایک گونہ اطمینان ہے کہ مصر کے مجمع البحوث اور راولپنڈی کی اسلامی کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی متجددین اور ملحدین کی شکست اور اسلام کی سچائی اور ابدیت کے اعلان کا ذریعہ بن جائے گی کہ جس ذات نے اسلام کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ ہر دور میں "فتنہ اور شر" کے ایسے ہی مواقع سے "خیر" کا پہلو ظاہر کراتا چلا آیا ہے ۔۔۔۔۔۔

حال ہی میں ہندوستان میں حضور نبی کریم فخر کائنات رحمت العالمین کی اعلیٰ و ارفع شان میں مشہور مؤرخ ٹوائن بی کی گستاخانہ حرکت پر مظاہرے ہوئے، بلاشبہ ناموس رسالت پر مر مٹنے والوں کا جان و مال سے بے نیاز ہو کر میدان میں کود پڑنا تقاضائے دین و ایمان ہے اور کوئی مسلمان ذلیل یورپ کی آئے دن کی ایسی کمینہ حرکات پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ ٹوائن بی اسلام کے حق میں مغربی علماء میں سب سے زیادہ وسیع الظرف حقیقت پسند

اور صاف گو بھتے ، مگر بالآخر اسکی اسلام دشمنی اور بدطینتی سے بھی مصنوعی پردہ سرک گیا اور حقیقت ظاہر ہوگئی کہ یورپ کا کوئی سکالر اور بڑے سے بڑا مؤرخ بھی اسلام اور نبی کریمؐ کے بارہ میں مخلص اور بلند حوصلہ نہیں ہو سکتا ، خواہ اس کا علم و تحقیق اسے اعتراف حق اور حق شناسی پر اسے بارہا مجبور کیوں نہ کر چکا ہو۔ ٹوائن بی کی اس غیر شریفانہ جسارت نے اسکی علمی ساکھ کو جو دھکا لگا دیا ہے اب وہ عمر بھر اسکی تلافی نہیں سکے گا۔ ٹوائن بی کے اس تعاملی مضمون کو ہندوستان کے ایک ہندو اخبار نے شائع کیا کہ اسے تو اپنے لیڈر گاندھی کی شخصیت اچھالنے کا ایک موقع ہاتھ آیا تھا، لیکن کیا ہمارے بعض سرکاری حلقوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ اس واقعہ کو "سیاسی اسٹنٹ" کے طور پر استعمال کریں ، ایسی باتوں کا وزن عمل اور کردار کی کسوٹی پر معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ اس معیار پر ہم خود کیسے اترتے ہیں۔؟ خود ہمارے ہاں حضور سرورِ کائنات علیہ السلام کی عظمت و تقدیس کتنی محفوظ ہے۔؟ اور ہمارے قلوب میں سرورِ کائناتؐ کی ناموس اور حرمت کا کیا حال ہے۔؟ کیا ان کی ذات ان کی نبوت ان کی سیرت اور ان کی سنت کی اعلیٰ و ارفع اور تشریعی حیثیت پر دست اندازی کرنے والوں کا ہم خود کچھ محاسبہ کر رہے ہیں۔؟ یا انہیں مختلف طریقوں ، سرکلر ، پریس نوٹ اور سرکاری نوٹسوں کے ذریعہ تحفظ دے رہے ہیں۔؟ کیا ہم حضور نبی اوّلین و آخرینؐ کی قبائے افتخار ختم نبوت کی عصمت و حرمت کو مجروح کرنے والوں کو کلیدی مناصب سے نواز رہے ہیں۔؟ کیا ہمارے ہاں نبوت کے لوازمِ ذات ، وحی ، اسکی عصمت اور کلام اللہ کی اعجازی حیثیت پر ریسرچ اور تحقیق کے نام سے ہاتھ نہیں چلایا جا رہا ، کیا فضل الرحمان ، غلام احمد پرویز اور بیسوی صدی کے مرزائی دجّال سے بڑھ کر توہین رسول کا مرتکب بھی کوئی ہو سکتا ہے۔؟ عیسائی یا کوئی دوسرا غیر مسلم اگر گستاخی کرے تو اسے شرک اور کفر کی وجہ سے اس کے عناد پر محمول کیا جاسکے گا مگر اسلام کا لبادہ اوڑھ کر علم و تحقیق اور الہام و مکاشفہ کی کمین گاہ میں بیٹھنے والے ڈاکوؤں سے ہمارا سلوک کیسا ہے۔؟ اگر کسی مسلم قوم اور کسی "اسلامی مملکت" میں حضورؐ کی عظمت اسلام کی حرمت اور اس کے بنیادی تقاضے محفوظ نہیں ہیں تو اسے کب زیب دیتا ہے کہ ایسی "غیر مسلم حرکات" پر چیخ و پکار کر کے اپنی سیاست کا اُلّو سیدھا کرنا چاہے جبکہ خود اپنے ہاں ایسی بے باکانہ جرأتوں کو نہ صرف یہ کہ بے لگام چھوڑ دیا گیا ہو بلکہ سرکاری سطح تک ایسے لوگوں کی صفائی کی جاتی ہو۔ ہاں اگر ہمارے قلوب عظمت نبوت اور مقامِ رسالت

کے اعتراف سے معمور ہیں، تو احتجاج تو کیا اگر ہماری جان ومال اور پوری متاعِ حیات بھی ناموس نبوت کی حفاظت پر قربان ہو جائے، تو اس سے اہم فریضہ اور اس سے بڑھ کر سرمایۂ سرخروئی اور کیا ہو سکے گا۔؟

ممتاز مسلمان عالم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حال مقیم پیرس نے دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ فقہ حنفی کی اہم ترین شخصیت امام محمد بن الحسن الشیبانی کی بارہ سویں برسی بڑے اہتمام سے منائیں جو کہ ۱۳۸۹ھ میں منائی جا رہی ہے۔ اس موقع پر یونیسکو نے امام شیبانی کی کتاب سیر کبیر کا فرانسیسی ترجمہ شائع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ امام اعظم کی فقہ کی اشاعت اور اسکی تدوین اور ترتیب میں امام محمدؒ کو بنیادی مقام حاصل ہے اور ان کی مذکورہ کتاب تو عالمی تاریخ میں بین الاقوامی علاقات اور قوانین پر قدیم ترین کتاب مانی گئی ہے، مسلمانوں کے ایک جلیل القدر فرزند کے علمی کارناموں کی یاد اور ان کی ترویج واشاعت اور تعارف کی غرض سے مشرق کے مایۂ ناز عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی یہ اپیل ہر لحاظ سے قابلِ توجہ ہے، مگر مسلمانوں میں آج کتنے ہیں جنہیں اپنے شاندار ماضی کے ایسے لاثانی افراد کے نام تک بھی معلوم ہوں، جن بزرگوں کے علوم اور آراء سے استفادہ اور اشاعت کو یورپ بھی اپنے بدترین تعصب کے باوجود ضروری اور قابلِ فخر سمجھ رہا ہو، آج خود مسلمانوں کو ان پر کتنا اعتماد اور ان کے علوم سے کتنا رابطہ ہے۔؟

یورپ کے خلائی تسخیری کارناموں اور سائنسی ترقیات، پھر اس کے ساتھ ایکدوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ اور اس جذبہ کے تحت اسلحہ کی بے تحاشا دوڑ ـــــ یہ سب چیزیں نگاہ میں رکھیئے اور پھر ذیل کی تازہ خبر پڑھ کر ان ہلاکت خیزیوں اور تباہ کاریوں کا اندازہ لگایئے جس کی طرف زمین کے باشندے ان ہی ترقیات کی بدولت دوڑتے چلے جا رہے ہیں ـــ امریکہ کے بیس میگاٹن بم کے بارہ میں خود امریکی سائنسدان لینس پالنگ کا کہنا ہے کہ اسکی تباہ کاری ایٹم بم سے سینکڑوں درجہ شدید ہے، اس کے موجودہ ذخیرہ کا عشر عشیر ۱/۱۰ حصہ ہشتم زدن میں ستر کروڑ انسانوں کو متاعِ حیات سے محروم کر سکتا ہے۔ اس بم کے پھٹنے سے تقریباً سو سو کلو میٹر کی نظروں تک زمین آگ اگلتی نظر آئے گی اور بالفاظ دیگر زمین خود جہنم بن جائے گی۔

پاکستانی وزیر خزانہ نے قومی اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ پچھلے دس سالوں میں غیر ملکی قرضوں کا سود ایک ارب ۴۳ کروڑ ۸۳ لاکھ روپیہ بنتا ہے یہ سود کی تباہ کاریوں کی ایک ادنیٰ مثال ہے، انفرادی حیثیت سے ہو یا قومی پیمانہ پر سود کا نتیجہ بہر حال استحصال و استعماد پوری قوم کے افلاس و ادبار اور معاشی لحاظ سے دوسروں کی کاسہ لیسی ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، قومی حیثیت سے تو اس کے اثرات پورے ملک کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کی صورت میں اور بھی شدید ہوتے ہیں، اس کے ظاہری فوائد اور منافع اگر کچھ ہوں تو چند روزہ ہوتے ہیں۔ امریکہ کی مثال لیجئے جس نے سود کے بل بوتے پر پوری انسانیت پر غلبہ اور استعماد کی عمارت کھڑی کی، مگر اسی نظام کی بدولت آج اس کا محفوظ سرمایہ صرف آدھا رہ گیا ہے، اور اکثر مغربی ممالک معاشی بحران سے دوچار ہیں۔ کیا اتنے بڑے پیمانے پر اس سے پہلے کبھی ارشاد خداوندی یمحق اللہ الربوا (اور اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے سود کو) کی صداقت ظاہر ہوئی تھی۔؟

جمہوریت کے قیام اور جبر و استبداد کے خلاف اٹھی ہوئی حالیہ تحریک کتنی بھی قابل تعریف کیوں نہ ہو مگر اس ضمن میں توڑ پھوڑ، اپنوں پر دست درازی، قومی سرمایہ کا ضیاع، ہلڑ بازی اور نہ جانے کیا کیا چیزیں سامنے آئیں جس نے ہمارے روبہ انحطاط معاشرہ کی ایک بھیانک تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ اصول و اخلاق کے دائرہ سے نکلکر بروں کے ساتھ اچھوں کو بھی مشق ستم بنانا کسی باوقار قوم کا شیوہ نہیں، خواہ اس کا تعلق حزب اقتدار سے ہو یا حزب اختلاف سے۔ اس ضمن میں ہماری مسلمان خواتین نے بھی کوئی اچھی مثال نہیں قائم کی، جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں نامحرم مردوں کے سامنے سڑکوں پر گشت کرنا، اچھلنا کودنا اور عام مجمعوں میں تقریریں کرنا پھر اخبارات میں اس کے فوٹو چھپوانا کسی لحاظ سے بھی قابل تحسین چیز نہیں ہو سکتی، سیاسی جدوجہد اور حقوق کی بحالی کے کام سے مردوں ہی کو نمٹنا چاہئے تھا، سیاست کی دیوی پر قومی روایات ملی احساسات عصمت و عفت اور غیرت و حمیت جیسی صفات کو نثار کر دینا صحتمند معاشرہ اور اخلاقی و دینی لحاظ سے کسی بہتر مستقبل کی نشاندہی نہیں کر رہا۔ ہم برائی کا راستہ بند کرنا چاہتے ہیں، مگر دوسری طرف سے بیشمار برائیوں کے بند کھول کر۔ حالانکہ برائی کو ہر لحاظ سے اور ہر حیثیت سے برائی سمجھنا چاہیئے، اسلام نے بعض انتہائی، استثنائی حالات کو چھوڑ کر عورت کو رونق خانہ

بانا چاہا ہے ، وہ اسے کسی حالت میں شمع محفل بننے کی اجازت نہیں دیتا ، مگر افسوس کہ حالیہ ردعمل نے مالی اور جانی نقصان کے ساتھ ساتھ ہمارے بہت سے قیمتی اور عزیز معنوی اقدار اور نظریاتی سرحدات میں بھی شگاف ڈالدیئے ہیں ، ہمیں اس ضمن میں پورے ملک بالخصوص شمال مغربی سرحدی علاقہ کے بعض سیاسی زعماء اور جماعتوں سے خاص طور پر شکوہ ہے جنہوں نے ہوا کے رخ پر چل کر پٹھان جیسی غیور وجسور قوم کی خواتین کو بازاروں اور سٹیجوں پر جلوہ طرازی کا موقع دیا جس سے ہماری اسلامی اور علاقائی روایات غیرت وحمیت خاص طور سے مجروح ہوئیں ۔ پختون قوم کی تاریخ پر یہ ایک شرمناک داغ ایسے ہاتھوں سے لگایا گیا ہے جو اس قوم کی انفرادی روایات کو محفوظ رکھنے کے نعروں میں پیش پیش ہیں ۔
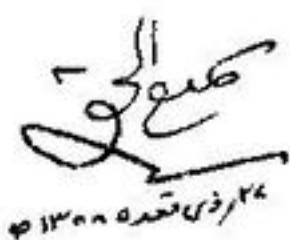
واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

سمیع الحق

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ

اَلْجَهْلُ مَوْتُ الْاَحْيَاءِ

جہالت زندوں کی موت ہے

اَلْحِرْصُ مِفْتَاحُ الذُّلِّ

حرص ذلت کی کنجی ہے

اَلْقَنَاعَةُ مِفْتَاحُ الرَّاحَةِ

قناعت آرام کی کنجی ہے

اَلتَّجْرِبَةُ عِلْمُ الْعَقْلِ

تجربہ عقل کا علم ہے

حضرت مولانا لطافت الرحمان صاحب
جامعہ اسلامیہ بہاولپور۔

قرآنِ کریم کس قسم کی کتاب ہے؟

اس سوال کا مختصر جواب

تو یہ ہے کہ یہ کتاب شاہی فرامین اور خدائی احکام و ارشادات کا مجموعہ ہے۔ اس کو خداوندِ پاک، خالقِ کائنات، مالکِ موجودات، احکم الحاکمین، رب العالمین نے نازل فرمایا ہے۔ جسکی صورت یہ ہوئی کہ مرکزی دفترِ اعلیٰ (لوحِ محفوظ) سے بیک وقت عالمِ انسان کے قریبی دفتر (آسمانِ دنیا میں) میں ایک طے شدہ نظامِ تکوین کے تحت نازل کر دی گئی۔ پھر حسبِ ضرورت جب اپنے اوقات اور حالات میں ان معقدات اور واردات کا ظہور ہوتا رہا۔ تو اس کتاب کے متعلقہ حصے (آیت یا چند آیات) کا نزول ہوتا گیا۔ اور ۲۳ سال کے عرصہ میں ان جواہر پاروں کا نزول مکمل ہوا۔ جنکا شیرازہ بظاہر تو منتشر تھا، لیکن درحقیقت نہایت مربوط و منظم اس وجہ سے تھا کہ ان کو اُس بندۂ خدا کی ہدایت و ارشاد سے یہ موجودہ کتابی شکل و ترتیب دے دی گئی تھی، جن پر کتاب نازل ہوئی۔ اور اس کتاب کو جو قاصد لے کر آتا رہا وہ بھی درگاہِ خداوندی کا انتہائی با اعتماد اور معزز و موقر فرشتہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھا۔ چنانچہ انہی کے بارہ میں فرمایا گیا — وانہ لقول رسول کریم — ذی قوۃ عند ذی العرش مکین۔ مطاع ثم امین۔

بلاشبہ یہ قرآن اس معزز قاصد کا لایا ہوا پیغام ہے جو بڑا طاقتور، خداوندِ عرش کے یہاں قدر و منزلت والا ہے، اور فرشتوں کا سردار اور امانت دار ہے، اور جسطرح اس کے معانی اور مضامین خداوند پاک کے ہیں، اسی طرح اس کے الفاظ و عبارات بھی اُس خدا کے ہی ہیں، جسکی حکمت و قدرت معلومات اور کمالات کی کثرت انسانی اندازہ سے باہر اور کائنات کے

احاطہ سے وراء الوراء ہے، خود فرما رہے ہیں:

قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً۔

کہہ دیجئے کہ اگر تمام سمندروں کو خدا کے کلمات لکھنے کیلئے بطور روشنائی استعمال کیا جائے اور ایک سمندر کا اضافہ بھی کیا جائے، تب بھی کلام الٰہی کا اختتام نہیں ہوگا۔

نیز فرمایا گیا ہے:

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمات اللہ ان اللہ عزیز حکیم۔

یعنی روئے زمین کے تمام درختوں کو قلم اور سمندروں کو روشنائی قرار دیا جائے بلکہ سات سمندر مزید ملا دیے جائیں تو بھی لکھتے لکھتے خداوند پاک کے کلمات ختم نہیں ہوں گے بیشک خدا غالب اور حکیم ہے۔

....

اب ظاہر ہے کہ جب خدا نے اپنی غیر متناہی کلمات کا وہ خلاصہ دنیا میں بھیجا جس میں تمام نسل انسانی کیلئے (بلکہ جن وانس دونوں کیلئے) تا قیام قیامت ہر طرح کے حکم و مصالح، عدل و انصاف کے اصول کو درج فرمایا۔ اور اس کامل و مکمل پیغام کا پیغام رساں بھی اپنے خاص الخاص بندوں میں سے ایسی عظیم ہستی کو قرار دیا جو نوع انسانی کا ایک بے مثال فرد ہے۔ اور جس میں انسانیت کے تمام کمالات واوصاف، دیانت وامانت اور خلق عظیم کے علاوہ فصاحت و بلاغت، دور فہمی اور نکتہ رسی وغیرہ بے شمار صلاحیتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے خوب فرمایا ہے ؎

فاحسن منک لم ترقط عینی   واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرّأً عن کل عیب   کانک قد خلقت کما تشاء

آپ سے زیادہ خوبصورت ہرگز نہیں دیکھا گیا، اور آپ سے زیادہ جمیل نہیں پیدا ہوا، آپ ہر نقص وعیب سے پاک پیدا کئے گئے، گویا اس طرز پہ پیدا ہوئے جو آپ نے چاہا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس خدائی پیغام کے فہم ونفاذ کے تمام ترذرائع اور اسباب مہیا کئے گئے، اور اس کے من وعن محفوظ ہو جانے اور اس کے بیان وتبیین کی ذمہ داری کا جو احساس آپ کو تھا اور جو فکر ان کو لاحق تھی اس بارہ میں بھی ان کو مطمئن کر کے فرمایا گیا: لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان

علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ ۔ (آپ عجلت حفظ کی خاطر اپنی زبان کو حرکت دینا بند کیجئے کیونکہ ہمارے ہی ذمہ ہے اس قرآن کو جمع کرنا اور آپ پر پڑھنا ہاں جب ہم نے پڑھا تب اس کو پڑھئے)

پھر ہم پر اس کا بیان بھی ہے۔ اللہ کا وہ بندہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہے، جن کا سلسلہ نسب ۲۴ پشتوں پر حضرت ابراہیمؑ سے ملتا ہے۔ یہ عرب قوم کے شریف تر خاندان قبیلہ قریش کے چشم وچراغ ہیں، ملک عرب میں ۵۷۱ء میں ان کی ولادت ہوئی، ولادت و بعثت سے قبل صرف عرب قوم نہیں بلکہ پوری انسانیت جس جہالت اور ظلمت میں تھی اور اپنے معبود حقیقی سے جس قدر دور اور نابلد تھی، اس کی داستان اوراق تاریخ میں درج ہے، اور خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے:

ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً	خدا وہ ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں
منھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم	میں انہی میں سے ایک ایسا رسول بھیجا جو
ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا	اُن پر خدا کی آیات پڑھتے ہیں اور ان کا
من قبل لفی ضلل مبین ۔	تزکیہ کرتے ہیں، اور ان کو کتاب اور حکمت

سکھاتے ہیں، اور یقیناً وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔

بہرکیف اس کم مدت میں محیر العقول کارناموں کی تکمیل فرما کر ۶۳۲ء میں ہدایت وعرفان کا یہ آفتاب عالمتاب بظاہر غروب ہوا، مگر ان کی تعلیمات اس قرآن کی وجہ سے جو اس کا ابدی و لافانی معجزہ ہے، زندہ ہے ؎

افلت شموس العالمین وشمسنا　　　ابداً علیٰ افق العلیٰ لا تغرب

تمام عالم کے سورج غروب ہوگئے اور ہمارا سورج بلندی کے افق پر ہمیشہ ہمیشہ تاباں ودرخشاں رہے گا۔

ہمارے اس اجمالی خاکہ سے اس سوال کا مختصر جواب بھی ہوگیا۔ تفصیل وتوضیح کی گہرائیوں اور بے پناہ وسعتوں کا پتہ بھی چلا کہ جب یہ مالک فرش وعرش کا کلام ہے، اور اسی حیاۃ کذائیہ سے واقعۃً اس ذات خداوندی کی طرف منسوب ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ کس قسم کی کتاب ہے ؏

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اب تشریح وبیان جو کچھ حسب موقعہ وحال ہے وہ یہ کہ قرآن کس قسم کی کتاب ہے:

اس سوال کا تجزیہ کر کے جواب میں چار عنوان قائم کئے جاتے ہیں، اور ہر ایک پر حسب توفیق لکھنے کے بعد دیگر تین حصوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

—— قرآن قرآن کی نظر میں —— قرآن رسول کی نظر میں —— قرآن اپنوں کی نظر میں ——

—— قرآن غیروں کی نظر میں ——

قرآن قرآن کی نظر میں

خود خداوند کائنات نے قرآن کے بارہ میں فرمایا ہے کہ یہ قرآن نہایت کامل و مکمل کتاب ہے عظیم رہنما ہے، اس کے برحق ہونے میں کسی کو ریب و تردد، قلق و اضطراب کی گنجائش نہیں اور جو لوگ اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کے اوصاف یہ ہیں:

ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدیً للمتقین الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ وممارزقنٰھم ..... الی ..... اولئک ھم المفلحون ۝ یہ کامل و مکمل کتاب ہے۔ اس میں تردد کی گنجائش نہیں، ان خداترسوں کیلئے کامل راہنما ہے، جن کے اوصاف حسب ذیل ہیں —— (آگے آیت میں) ھم المفلحون تک ان متقین کے اوصاف ہیں، دوسری جگہ قرآن کو نور فرمایا یاایھا الناس قد جاءکم برھان من ربکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا۔ (اے لوگو تمہارے پاس خدا کیطرف سے برہان اور نور آیا ہے) قرآن کو حق بھی فرمایا: "یاایھا الناس قد جاءکم الرسول بالحق من ربکم فاٰمنوا خیراً لکم (اے لوگو! تمہارے پاس حق کتاب کو لے کر رسول آیا، تم اس پر ایمان لے آؤ اور اپنے لئے خیر کی جستجو کرو۔)

...

قرآن سیدھی راہ دکھاتا ہے:

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ یہ قرآن اس راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو نہایت سیدھا ہے۔

قرآن غور و فکر، عمل و تدبر کیلئے نازل ہوا ہے۔

انا انزلنا علیک القرآن لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔ ہم نے آپ پر قرآن کریم نازل کیا، تاکہ آپ اس کو لوگوں سے بیان کریں اور اس میں غور و فکر کریں۔

قرآن باطل کی آلائشوں سے صاف اور منزہ ہے :

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔

اس قرآن کے پاس باطل نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ حکیم وحمید خدا کی نازل کردہ کتاب ہے۔

قرآن ضروری امور کا تبیان ہے :

تبیانا لکل شیٔ وھدیً ورحمۃ وبشریٰ للمؤمنین۔

اس قرآن کو ہر شے کا تبیان اور ہدایت و رحمت اور بشارت بنا کر نازل کیا گیا۔

قرآن کے نغمۂ حق سننے سے انسان کے علاوہ جنات کی ایک جماعت نے جو اثر لیکر اسلام قبول کیا اور قرآن کے بارہ میں جو رائے قائم کی اور شرک کے خلاف جو باہمی عہد و پیمان کیا اس کا ذکر حق تعالیٰ نے فرمایا :

قل اوحی الیّ انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرآنا عجبا۔ یھدی الی الرشد فآمنا بہ ولن نشرک بربنا احدا۔

کہہ دیجئے کہ مجھے وحی کے ذریعہ بتایا گیا کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن سنا تو کہا کہ ہم نے ایسا عجیب قرآن سنا جو راہ راست بتلاتا ہے، ہمارا تو اسی پر ایمان ہے۔ اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے۔

قرآن اپنی ظاہری و باطنی، لفظی اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے سننے والے کے گوشت و پوست کو متاثر کرتا ہے۔

اللہ نزل احسن الحدیث کتابا متشابھا مثانی تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم ثم تلین جلودھم وقلوبھم الی ذکر اللہ ذالک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء ومن یضلل اللہ فمالہ من ھاد۔

خدا نے بہت عمدہ کلام نازل فرمایا ہے، جو ایسی کتاب ہے کہ اس کے مضامین باہم ملتے جلتے ہیں، بار بار دہرائی گئی ہے جس سے ان لوگوں کے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں بدن کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کو وہ چاہتا ہے اس کے ذریعہ ہدایت دیتا ہے۔ اور خدا جس کو گمراہ کرتا ہو۔ اس کا کوئی ہادی نہیں۔

قرآن کو انتہائی حکیمانہ اور حاکمانہ قانونی نظم ونسق اور عدل وضبط کی وجہ سے ثقیل کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے :

انا سنلقی علیک قولا ثقیلا — ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں۔

قرآن میں کتنا جلال اور زور ہے۔ فرمایا ہے :

لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ۔ — اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھ لیتے کہ وہ پہاڑ خوف خدا سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

...

قرآن رسول کی نظر میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

ان ھذا القرآن مادبۃ اللہ فاتوا من مادبتہ ما استطعتم، ان ھذا القرآن حبل اللہ وھو النور المبین والشفاء النافع عصمۃ لمن تمسک بہ ونجاۃ لمن تبعہ لا یعوج فیقوم ولا یزیغ فیستعتب ولا تنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد (رواہ ابن ابی شیبۃ ومحمد ابن نصر وابن الانباری فی المصاحف والحاکم والبیہقی عن ابن مسعود)

یہ قرآن خدا کا دستر خوان ہے تم سے جہاں تک ہو سکے، اس سے کچھ حاصل کرو، یہ قرآن خدا کی رسی ہے اور یہ نور مبین اور شفاء نافع ہے یہ قرآن عذاب خداوندی سے بچاؤ اور نجات کا ذریعہ ہے ان کیلئے جنہوں نے اس پر اعتماد اور عمل کیا یہ قرآن راہ حق سے منحرف نہیں ہوتا، تاکہ سیدھا کیا جاوے، اور نہ ہی اس کے عجائب ختم ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی بار بار دہرانے سے پرانا ہو جاتا ہے۔

...

نیز فرماتے ہیں :

انھا ستکون فتنۃ قیل فما المخرج قال کتاب اللہ فیہ انباء من قبلکم وخبر من بعدکم وحکم ما بینکم وھو الفصل لیس بالھزل من ترکہ — عنقریب ایک فتنہ برپا ہوگا، عرض کیا گیا کہ حضور پھر اس سے مخلص کیا ہو، فرمایا خدا کی کتاب اس میں گذشتہ اقوام وملل کی پوری خبر اور آئندہ نسلوں کا پورا حال درج ہے اور یہ تمہارے

من جبار قصمہ اللہ ومن ابتغی الھدی من غیرہ اضلہ اللہ وھو حبل اللہ المتین۔
(رواہ الترمذی عن علیؓ وابن مسعود)

باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے والا ہے یہ کوئی دوراز کار چیز نہیں ہے جس ظالم نے اسکو چھوڑا، اسکو خدا ہلاک کرے گا۔ اور جس نے کسی اور سے ہدایت حاصل کرنا چاہی وہ گمراہ ہوجائے گا۔ یہ قرآن خدا کی مضبوط رسی ہے ــــــ۔

مزید فرمایا:

مامن الانبیاء من نبی الا اعطی من الآیات ما مثلہ آمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیتہ وحیًا اوحی اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعًا یوم القیامۃ
(رواہ مسلم عن ابی ہریرہ)

ہر نبی کو جو بھی معجزہ دیا گیا ہے تو اس جیسے معجزات پر لوگ ایمان لائے ہیں اور جو کتاب مجھ کو دی گئی ہے، یہ بے مثال ہے اس وجہ سے میری امید ہے کہ قیامت کے روز میرے متبعین سب سے زیادہ ہوں گے۔

قرآن اپنوں کی نظر میں

قرآن کو جن بندگان خدا نے اپنایا، جنہوں نے اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق کلی یا جزوی طور سے اس پر عمل کیا اور قرآن نے ان کو انسانیت کا سبق دیا، انہوں نے قرآن کو ایک مکمل لائحہ عمل پایا اس کتاب پر عمل پیرا امت کی نظر میں اس کا کمال محض عقیدت اور تقلید و وابستگی پر مبنی نہیں بلکہ اصل حقیقت اور نری واقعیت پر اپنے پیش کردہ اغراض و مقاصد میں بہمہ وجوہ نہایت کامیاب اور مؤثر ہونے پر مبنی ہے، ان لوگوں نے اس کتاب کو ہر جہت اور ہر لحاظ سے آزمایا، اور اس میں دنیا و آخرت کی فلاح و نجات پائی اس کتاب سے انہوں نے قلوب و ضمائر کو صاف کیا، انہوں نے اس کتاب میں دین پایا، دنیا پائی، سیاست و حکمت پائی، عدل و انصاف پایا، غرض اس کتاب پر جس قدر غور کیا گیا، یا کیا جاسکا اس کے محاسن و کمالات ظاہر ہوتے گئے ـــ

یزیدک وجھہ حسنًا اذا ما زدتہ نظرًا

اس کے چہرہ میں جس قدر زیادہ غور و نظر کروگے اس قدر اس سے حسن و جمال کا ظہور ہوگا ــــــ۔

درحقیقت قرآن پر ایمان لانے والے صحابہؓ، تابعین، علماء، محدثین، فقہا، صلحاء، حکماء، مؤرخین، مفسرین نے قرآن سے جو اثر لیا اور قرآن کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا کسی طبقہ وجماعت نے مجموعی طور پر یا کسی شخص نے انفرادی صورت سے کیا ہے۔ اور پورا ذخیرہ نہ یہ کہ موجود ہے بلکہ ہر دور میں اس میں اضافہ ہونا قائم و دائم ہے۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

علمائے امت نے قرآن کریم پر مختلف طور وطریق سے غور کر کے اس سے ان بیشمار علوم کو اخذ کیا جن میں سے اکثر وبیشتر وہ ہیں جن سے صرف مسلمان قوم ہی نہیں بلکہ پوری بشریت فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اگر قرآن نازل نہ ہوتا اور ان عجیب وغریب علوم کی ایجاد نہ ہوتی تو انسان کا علمی سرمایہ نہایت ناقص وناتمام ہوتا، وہ افادیت، فہم معنی کا ضابطہ اور سہولت یقیناً نہ ہوتی جن کی رہنمائی قرآن سے اخذ شدہ علوم نے کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر اتقان میں براہ راست قرآن سے اسی علوم کو اخذ کیا۔ اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی علی سبیل الاختصار ہیں، قرآن سے اخذ شدہ چند مروج علوم وفنون حسب ذیل ہیں:-

صرف نحو، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع، فقہ، حدیث، فرائض اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، علم کلام، علم تجوید، علم تصوف، علم الاخلاق، تعبیر الرؤیا، علم الحساب، علم طب، اصول فقہ، وغیرہ وغیرہ۔

علامہ طنطاویؒ نے تو اپنی عجیب وغریب تفسیر جواہر القرآن میں قرآن کی بلاغت کا ایک انوکھا معنی یہ بیان کیا ہے، کہ کائنات عالم سے متعلق تمام مادی اور تکوینی تحقیق وتجسس کو غایت اور نہایت تک پہنچایا، اجسام سفلیہ اور اجرام علویہ اور فضا کی لامحدود وسعتوں کا کھوج لگانا یہ بھی قرآن کی بلاغت ہے، اور بتایا کہ قرآن میں احکام شرعیہ سے متعلق اگر ۱۵۰ آیات ہیں جنکی روشنی میں قیامت تک انسان کیلئے ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا ہے تو علم النفس اور علم الآفاق سے وابستہ ۷۵۰ آیات ہیں۔

مگر افسوس کہ علماء کرام نے قرآن کریم کے تشریحی پہلو اور لفظی بلاغت پر تو غور کیا اور اسکی معنوی علمی معلوماتی بلاغت پر مناسب توجہ نہ دی، اور اسی غفلت اور بے توجہی کو مسلمان قوم کے انحطاط کا سبب قرار دیا ہے۔

وللہ درصاحب الامالیۃ حیث یقول ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

قرآن کریم میں تمام علوم ہیں مگر لوگوں کے افہام ان کے ادراک سے قاصر ہیں

قرآن کریم ہی کے طفیل اُن کے علوم کے سلسلہ میں ابتدائی وتمہیدی علم وفن (گرامر) کو لیا جائے یا بلاغت وبیان کے اصول کو دیکھا جائے جس نے قرآن کے وجوہ اعجاز بیان کرکے دنیا والوں کو قرآن کے نرالے طرز تعبیر اور انداز بلاغت سے آگاہ کیا ہے۔ قرآن کی عبارت دلالت، اشارت مقتضیٰ آیات محکمات اور متشابہات، غرض ہر ہر لفظ حکم ومعارف عبر ونکات نکات کا گنجینہ ہے۔ کس کس کو گنا جائے ؎

دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

امام ابو حنیفہؒ نے قرآن سے تیرہ لاکھ احکام کا استنباط کیا ہے۔ جبکہ باقی آئمہ مذاہب نے ایک کروڑ مسائل کا استنباط کیا ہے۔ قرآن سے متعلق جو گراں قدر عظیم الشان یادگار زمانہ تصنیفات وتالیفات کا علمی ذخیرہ ہے ان سے کس کس کو دیکھ کر قرآن کی عظمت وجلال اور جامعیت وکمال کا اعتراف کیا جائے علوم فرعیہ کے سلسلہ میں فقہاء اوّلین کی مبسوطات مبسوطات ــــ کو چھوڑ کر صاحب ہدایہ، امام برہان الدین مرغینانی کی کفایۃ المنتہی کو دیکھا جائے جس کو اوّلاً مکمل اسی۸۰ جلدوں میں لکھا گیا ہے۔ پھر درس وتدریس کی سہولت کی خاطر موجودہ ہدایہ کی صورت میں صرف چار جلدوں میں اس کا اختصار کیا گیا ہے، جو پھر بھی چار ضخیم علمی فقہی جواہر پارے اور بیشمار مسائل پر مشتمل عظیم دفاتر ہیں۔ یا فن حدیث میں بخاری کی شروح وغیرہ کو دیکھا جائے یا براہ راست قرآن کی تفسیر وتشریح کا جو بے پناہ طویل سلسلہ ہے اس میں امام غزالیؒ کی تفسیر یاقوت التاویل فی اسرار التنزیل کو دیکھا جائے جو ایک ۱۰۰سو مجلدات میں لکھی گئی ہے، یا امام محی الدین ابن عربی کی تفسیر حدائق ذات بہجہ پر نظر ڈالی جائے جو ۵۰۰ جلدوں میں لکھی گئی ہے، اور سورت فاتحہ کی سات آیتوں سے متعلق ۲۵ جلدوں میں سے ۵ مکمل جلدیں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ـــ سے متعلق ہیں۔ یا تفسیر علائی شیخ محمد بن عبدالرحمان بخاری اور تفسیر الاستغناء شیخ ابوبکر محمد کو سے لیا جائے جو ہر ایک، ایک ایک ہزار جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ نیز دہ جو شیخ عبدالوہاب نے قرآن کی تفسیر ایک لاکھ اشعار میں لکھی ہے۔

قرآن بیشک ایک لامتناہی علوم اور معلومات کا خزانہ اور ہر لحاظ سے دریگانہ ہے جس سے

بقول ابن عربی ستر ہزار علوم کا استخراج کیا گیا ہے، اور اگر ایک طرف الفاظ و تراکیب کے اعتبار سے بحر ذخار ہے تو دوسری طرف مقصد و معنی کی رو سے بے مثال ہے، اس کے الفاظ کی فصاحت و بلاغت اسالیب و تراکیب کی موزونیت انسانی قدرت سے کہیں بالا و برتر ہے نہ تو اس کے معجز طرز بیان کو جلال و وقار کے لحاظ سے سمندر کی عظیم اور مہیب موجوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، اور نہ اسکی حلاوت و شیرینی کو شہد و عسل کی شیرینی قرار دیا جا سکتا ہے ۔

مظلومة القد فی تشبیھہ غصنا   مظلومة الریق فی تشبیھہ ضربا

اس محبوبہ کے قد کو نرم شاخ سے تشبیہ دینا بھی ظلم ہے، اور اس کے لعاب کو شہد و عسل سے تشبیہ دینا بھی اسکی کسر شان ہے۔

قرآن نے اپنوں کے رگ و خون میں اپنے بارہ میں جس احترام و ادب کا جذبہ پیدا کیا، اس کا اندازہ حضرت عثمان بن عفانؓ کے اس معمول سے ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد قرآن کو بوسہ دے کر فرماتے تھے کہ یہ خدا کا منشور، قابل ادب و احترام (فرمان) ہے، جو اس نے اپنے بندوں کے نام بھیجا ہے۔ قرآن کریم کے تقدس نے ذلیل کو عزیز اور صغیر کو کبیر کر دیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت نافعؓ کو مکہ مکرمہ پر عامل بنایا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بلانے پر ایک سفر میں مقام عسفان پر دونوں کی ملاقات ہوئی، تو حضرت عمرؓ نے حضرت نافعؓ سے دریافت کیا کہ مکہ مکرمہ میں اپنا جانشین کس کو مقرر کر کے آئے ہو۔؟ نافعؓ نے کہا: ابن ابزیٰ کو۔ خلیفہ نے فرمایا وہ کون ہے۔؟ نافعؓ نے کہا: وہ ہمارے آزاد کردہ غلاموں سے ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: مکہ مکرمہ جیسے اہم اور مرکزی اسلامی شہر پر ایک مولیٰ کی خلافت اور جانشینی کیسی؟ تو حضرت نافعؓ نے کہا ـــــ انہ عالم بکتاب اللہ وعالم بالفرائض۔ چنانچہ اس انتخاب فاروق اعظمؓ خوش ہوئے اور اسکی تائید میں فرمایا: اما ان نبیکم، قال ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواماً ویضع بہ آخرین۔ (حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے کسی قوم کو عزت دیتا ہے اور کسی کو ذلت یعنی جس نے اپنا تعلق قرآن سے پیدا کیا معزز ہوا اور جس نے نہ کیا ذلیل ہوا۔

قرآن غیروں کی نظر میں

۱۔ چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں ہے۔ "قرآن نے ظلم، جھوٹ، غرور، انتقام، غیبت، طمع، فضول خرچی، حرام کاری، خیانت، بد دیانتی اور بدگمانی کی بہت سخت برائی کی ہے، اور یہ اسکی بڑی خوبی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر گستاولی بان فرانسیسی کہتا ہے: "قرآن دلوں میں ایسا زندہ اور پُر زور ایمان پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔

۳۔ سر ولیم میور کہتا ہے۔ "قرآن نے فطرت اور کائنات کی دلیلوں سے خدا کو سب سے اعلیٰ ہستی ثابت کیا ہے اور انسان کو خدا کی اطاعت اور شکر گزاری پر جھکا دیا ہے۔

۴۔ ڈاکٹر جانسن: "قرآن کے مطالب ایسے مناسب وقت اور عام فہم ہیں کہ دنیا ان کو آسانی سے قبول کر سکتی ہے۔ مگر افسوس کہ ہم کو دیکھ دیکھ کر دنیا اس سے نفرت کر رہی ہے۔"

۵۔ مسٹر عمانوئل ڈی انش: "قرآن کی روشنی اسوقت یورپ میں نمودار ہوئی جب تاریکی محیط ہو رہی تھی، اور اس سے یونان کے مردہ عقل اور علم کو زندگی مل گئی۔"

۶۔ پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کہتا ہے: "جوں جوں قرآن پر غور کرتا ہوں اور اس کے مفہوم و معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں، میرے دل میں اسکی قدر و منزلت زیادہ ہوتی جاتی ہے لیکن اس ...... کا مطالعہ بجز ایسی حالتوں کے کہ ...... یا تحقیق لسانی یا اس قسم کی دیگر اغراض کے لئے پڑھا جائے، طبیعت میں تکان پیدا کرتا ہے اور بار خاطر ہو جاتا ہے۔

۷۔ پروفیسر رینالڈ اے نکلسن: "قرآن کے اثر سے عربی زبان تمام اسلامی دنیا کی متبرک زبان بن گئی اور قرآن نے دختر کشی کا خاتمہ کر دیا۔"

۸۔ مسٹر ایچ، ایس لیڈر: "تعلیم قرآن سے فلسفہ و حکمت کا ظہور ہوا، اور ایسی ترقی کی کہ اپنے عہد کی بڑی سے بڑی یورپین سلطنت کی تعلیم حکمت سے بڑھ گیا۔"

۹۔ مسٹر اے ڈی ماربل: "اسلام کی قوت و طاقت قرآن میں ہے، قرآن قانونی اثاثہ ہے، اور حقوق کی دستاویز ہے۔"

۱۰۔ جان جاک ریسک جرمنی فلاسفر : "جبکہ قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بیتاب ہو کر سجدہ میں گر پڑتے تھے، اور مسلمان ہو جاتے تھے۔

۱۱۔ تھیوڈور نولڈکی : "قرآن لوگوں کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ معبودان باطل سے پھیر کر ایک اور معبود حق کی طرف لاتا ہے، قرآن میں موجودہ دور اور آئندہ کے تمام علوم و فنون میری کتاب القرآن میں ملاحظہ کرو۔"

۱۲۔ مسٹر سٹینلے لین پول : "قرآن میں سب کچھ موجود ہے جو ایک بڑے مذہب میں ہونا چاہئے۔ اور جو ایک بزرگ انسان (محمدؐ) میں موجود تھا"

۱۳۔ مسٹر جے ، ٹی ، بٹانی : "قرآن نے بے حد و شمار انسانوں کے اعتقاد و چلن پر نمایاں اثر ڈالا ہے، اور سائنس کی دنیا نے قرآن کی ضرورت کو اور واضح کر دیا ہے۔"

۱۴۔ ایچ ، جی ، ویلز : "قرآن نے مسلمانوں کو ایسے مراخات اور بندھن میں باندھ رکھا ہے جو نسل اور زبان کے فرق کے پابند نہیں ہے۔

۱۵۔ پادری وارشن ڈی ، ڈی : "قرآن کا مذہب، امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔"

۱۶۔ ہندو فاضل اڈمنڈ ٹرک : "اسلامی (قرآن) قانون ایک تاجدار سے لے کر ادنیٰ ترین افراد رعایا تک کو جاری ہے یہ ایک ایسا قانون ہے جو ایک معقول ترین علم فقہ پر مشتمل ہے، جس کی نظیر اس سے بیشتر دنیا پیش نہیں کر سکتی ہے۔

۱۷۔ بابا نانک : "توریت، زبور، انجیل اور وید وغیرہ سب کو پڑھ کر دیکھ لیا۔ قرآن شریف ہی قابل قبول اور اطمینان قلب کی کتاب نظر آئی۔ اگر سچ پوچھو تو سچی اور ایمان کی کتاب جسکی تلاوت سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے قرآن شریف ہی ہے۔

۱۸۔ بابا بھوپندر ناتھ باسو : "تیرہ سو برس کے بعد بھی قرآن کی تعلیم کا یہ اثر موجود ہے کہ ایک خاکروب بھی مسلمان ہونے کے بعد بڑے خاندانی مسلمان کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

۱۹۔ بابو بپن چندر پال : "قرآن کی تعلیم میں ہندوؤں کی طرح ذات پات کا امتیاز موجود نہیں ہے نہ کسی کو محض خاندانی و مالی عظمت کی بناء پر بڑا سمجھا جاتا ہے۔"

۲۰۔ مسز سروجنی نائیڈو : "قرآن کریم غیر مسلموں سے بے تعصبی اور رواداری سکھاتا ہے، دنیا اس کی پیروی سے خوشحال ہو سکتی ہے۔"

۲۱۔ مہاتما گاندھی : "مجھے قرآن کو الہامی کتاب تسلیم کر لینے میں ذرا بھر بھی تامل نہیں ہے۔"

(قرآن کیا سکھاتا ہے؟ یہ آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ

اشتراکیت کے بنیادی افکار پر تنقید

سرمایہ داری، کمیونزم اور اسلام پر حضرت مولانا کے افادات کا کافی حصہ الحق میں شائع ہو چکا ہے اس وقت وہ حصہ پیش ہے جس میں اشتراکیت کے بنیادی افکار پر تنقید کی گئی ہے۔

"ادارہ"

اشتراکی نظام اور انسانی فطرت اشتراکیت کا پورا نظام چونکہ خالص جذباتی نظام ہے اس لئے یہ نظام سراسر عقل اور انسانی فطرت کے خلاف جنگ ہے، یہ حقیقت ہے کہ غیر فطری امر کو انسان جبر و تشدد کے بغیر قبول نہیں کرتا، کمیونسٹ ممالک سے اگر ایک لمحہ کے لئے بھی جبر و تشدد ہٹ جائے تو وہاں کے عوام اس نظام کو توڑ کر اپنی اصلی فطرت پر آجائیں گے۔ لہذا یہ تحریک قسری و جبری تحریک ہے جس کو تشدد نے عوام پر مسلط کر دیا ہے جس وقت آہنی قلعہ ٹوٹ جائے گا، تو یہ تحریک پارہ پارہ ہو جائے گی۔

اختصاص فطری کے خلاف جنگ اشتراکی نظام جبری ہے، اور اختصاصی نظام فطری ہے، یعنی انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ آزاد ہو کر جائز طریقے سے اپنے لئے رزق کمائے اور اسکی کمائی ہوئی دولت مساکین کے حقوق کی ادائیگی کے بعد اسکی ذات اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ سے مختص ہو۔ یہ اختصاص فطرت انسان میں موجود ہے۔ اور کوئی انسان ایسا نہیں کہ وہ اختصاصی جذبہ سے خالی ہو۔ اب اشتراک اس اختصاص فطری کی ضد ہے کہ خاص چیز کو عام اور مشترک قرار دیا جائے، اسکی مثال بعینہ پانی کی طرح ہے کہ پانی کی فطرت سرد ہونا ہے۔ اب اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے یا دھوپ میں رکھا جائے تو اس میں آگ یا دھوپ نے بالجبر اور فطرت کے برخلاف گرمی پیدا کی۔ لہذا جب تک آگ

یا دھوپ کا تعلق اور تسلط رہے گا، پانی اپنی فطرت کے برخلاف سرد رہے گا، لیکن جب پانی پر سے آگ یا دھوپ کا تسلط ختم ہو گا تو پانی بغیر کسی بیرونی سبب کے خود بخود سرد ہو جائے گا، اسی طرح کمیونسٹ عوام کی فطرت سے جس وقت اشتراکیت کا تسلط ختم ہو جائے گا تو فوراً اشتراکیت کی جگہ اختصاصیت آجائے گی جو انسانی فطرت ہے۔

شخصی آزادی کے خلاف جنگ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اکتساب رزق اور مالکانہ اختیارات میں آزاد ہو، حیوانات کی طرح دوسروں کا آلہ کار نہ ہو لیکن اشتراکی نظام اسی فطری جذبے کو ختم کر دیتا ہے۔ ہم نے لینن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اشتراکیت کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اس سے پہلے جانوروں پر سوار ہوتا تھا، اب انسانوں پر سوار ہو گا۔ تمام قومیں حق خود اختیاری کو تسلیم کرتی ہیں اور سیاسی آزادی کیلئے لڑ رہی ہیں۔ لیکن اگر سیاسی غلامی کے ساتھ شخصی غلامی بھی شامل ہو تو انسان کا شرف انسانیت ختم ہو جاتا ہے اور وہ ریاست کو کمانے کے لئے ایک جامد مشین بنا تا ہے۔ جس سے اس کا فطری حق اور انسانی اختیارات ختم ہو جاتے ہیں۔ اشتراکیت اسی فطری جذبۂ انسانیت کے خلاف جنگ ہے۔

انسانی معاشرے کی تنظیم حاجت باہمی پر مبنی ہے اشتراکیت اس کے خلاف جنگ ہے۔ انسانی معاشرے کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ افراد معاشرہ میں باہمی ارتباط زیادہ ہو، اس لئے فطرت نے انسان کو ایک دوسرے کا محتاج بنا دیا ہے، تاکہ معاشرہ مستحکم اور مربوط ہو اور یہ حاجت فطرت نے دو طرفہ رکھی ہے، صاحب مال مزدور کے عمل کا محتاج ہے، اور مزدور اجرت عمل کا محتاج ہے تا وقتیکہ یہ دو طرفہ حاجت قائم ہو تو افراد معاشرہ باہم کہ مربوط ہوں گے، لیکن اگر سب ریاست کے لئے کام کریں، تو ارباب ریاست سے تو ربط ہو گا، لیکن آپس میں ارتباط ختم ہو جائے گا، قرآن پاک میں لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا سے اس کی حکمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اشتراکیت انسانی اخلاق فاضلہ کے خلاف جنگ ہے۔ انسان کی بلندی اس کے اخلاق فاضلہ سے وابستہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر احسان کرے، ایثار کرے، ہمدردی کرے، رحمت و شفقت برتے لیکن اگر سب یکساں طور پر صرف ریاست کے کارندے ہوں تو یہ فطری شریف اخلاق ختم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ غیر فطری مساوات میں ان اخلاق کے

ظہور کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

اشتراکیت انسان کی فطری تفاوت کے خلاف جنگ ہے۔ مال کمانے کے لئے فطرت نے انسان کو دو قوتیں دی ہیں، فکری قوت جس کے ذریعہ تعلیم یافتہ طبقہ مال کماتا ہے۔ اور جسمانی قوت جس کے ذریعے مزدور کسان کماتے ہیں۔ فطرت نے انسان کی فکری قوت بھی یکساں نہیں رکھی کوئی ایک وقت میں کمزوری کی وجہ سے کم کام کرتا ہے۔ کوئی قوت کی وجہ سے زیادہ۔ جب کمانے کے اسباب میں فطری تفاوت موجود ہے تو اس کے نتیجے میں یعنی مال میں بھی تفاوت ہوگا، کوئی کم مالدار کوئی زیادہ ہوگا، اس لئے اشتراکیت کی مصنوعی مساوات اس فطری تفاوت کے خلاف جنگ ہے۔

اشتراکیت میلان الی اللہ کے خلاف جنگ ہے انسان کی فطرت میں اگر جسمانی طور پر کھانے پینے کی طرف میلان موجود ہے، تو روحانی طور پر اس کے اندر فطرۃ خدا کی محبت اور میلان بھی موجود ہے اور انسان کی پوری تاریخ اس فطری جذبۂ محبت خداوندی کا مظہر ہے۔ لیکن اشتراکیت اس حقیقی خدا کی محبت کے خلاف جنگ ہے اور انسانوں پر چند کامریڈوں کی خدائی مسلط کرتا ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی افکار پر تنقید

فکر اشتراکیت کی شریعت میں کارل مارکس کو پیغمبر کی طرح تقدس حاصل ہے، اس لئے ہم مارکس فلسفہ کے افکار اس کی ایک کتاب "سرمایہ" سے نقل کرکے اس پر تنقید کرتے ہیں تاکہ اس کی تضاد بیانی اور افکار کی ژولیدگی ناظرین پر واضح ہو جائے۔ ہیگل افلاطونی فلسفہ کی طرح افکار و تصورات کو اصل مؤثر عامل اور حقیقت سمجھتا ہے اور فطرت کائنات اور انسانی تاریخ اور واقعات کو اس کا تابع سمجھتا ہے، لیکن ہیگل کا متبع مارکس تصوریت کو خارجیت کا تابع سمجھتا ہے۔ لیکن واقع میں دونوں نظریات کلی رنگ میں غلط اور جذباتی ہیں۔ کیونکہ بعض جگہ تصوریت اصل اور خارجیت کی تابع ہے، جیسے ایک انجینئر ایک چھاؤنی کا نقشہ ذہن میں تصور کرتا ہے، اور یہ فرض کیا جائے کہ وہ نقشہ صرف اختراعی ہے اور اسکی نظیر پہلے سے موجود نہیں تو اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ اس تصور کے بعد جب

وہ چھاؤنی تعمیر پاتی ہے تو یہاں تصوریت اصل ہے اور چھاؤنی کا خارجی وجود اس کا تابع ہے کہ اس تصوری نقشے کے تحت وہ ظہور میں آیا، اس لئے مارکس کا ہر جگہ خارجیت کو اصل اور تصوریت کو تابع قرار دینا غلط ہے، لیکن بعض حالات میں خارجیت اصل ہوتی ہے، اور تصوریت تابع۔ مثلاً ہم نے ایک بوٹی کو ایک مرض کے لئے بار بار استعمال کیا اور وہ اس مرض میں مفید ثابت ہو کر اس نے مرض کو دور کیا تو اس خارجی عمل سے ایک تصور قانون تعلیل کا پیدا ہوا کہ فلاں بوٹی فلاں مرض کے ازالہ کی علت ہے۔ اسی طرح سائنس کے تمام مادی تجربات کا حال ہے کہ پہلے خارجی وجود میں اشیاء کا تجربہ کیا جاتا ہے۔ پھر ایک قانون کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ مثلاً پانی سے بجلی اس طرح پیدا کی جاتی ہے اور اسٹیم اسطرح پیدا ہو کر اس کے ذریعہ گاڑی چلائی جاتی ہے۔ یہاں پر خارجی تجربات پہلے کئے جاتے ہیں اور ان سے تصوری قانون تعلیل بعد میں پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام صورتوں میں خارجیت اصل ہے، اور تصوریت تابع ہے لہذا مارکس کا یہ نظریہ غلط ہے کہ تمام صورتوں میں تصوریت تابع اور خارجیت اصل ہے اس کے علاوہ ان دونوں مادی فلسفیوں کو یہ اقرار ہے کہ خارجیت اور تصوریت لازم ملزوم ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مادہ اور اسکی حرکت کو ازلی مانتے ہیں، اور فطرت کائنات کو حرکت مادہ کا نتیجہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ کہ نہ خدا کی ضرورت ہے اور نہ فطرت کائنات کے وجود کے لئے ارادہ کی حاجت ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ خارجیت کیساتھ تصوریت ضروری ہے یا پہلے یا پیچھے تو مادہ اور اسکی حرکت کو جب عالم خارجیات کے لئے خدا کے مقام پر رکھا گیا تو وہ باتفاق فلاسفہ شعور اور علم اور تصور سے خالی ہے تو اس میں تصوریت کہاں سے آئے گی۔ یہ تناقض اور تضاد ہے۔

۲۔ فکر | مارکس کہتا ہے کہ مذہب جن اسباب و عوامل سے پیدا ہوا وہ خوف و بیچارگی کا احساس ہے۔ اب فطرت خارجی پر ایک حد تک انسان نے قابو پالیا اس لئے خوف و دہشت باقی نہیں رہی تاکہ مذہب کا سہارا لینے کی ضرورت ہو۔

۲۔ تنقید | مارکس کا یہ فلسفہ بھی سو فیصدی غلط ہے کہ :-

۱۔ مذہب خوف سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اشتراکی مذہب بھی معاشی خوف سے پیدا ہوا۔

۲۔ فطرت خارجی پر قابو پانے سے خوف زائل ہوا۔ اگر زائل ہوا تو پھر اشتراکی مذہب

کیوں پیدا ہوا جبکہ فطرت پر قابو پا لیا گیا ہے، کیونکہ اشتراکیت بھی ایک مذہب ہے۔ جیسے ہم نے ثابت کیا ہے۔ اور کیا اس وقت جبکہ فطرت پر قابو پا لیا گیا ہے، تو خوف پر قابو پانے سے خوف کا دور ہونا بالکل غلط ہے۔ اس کے علاوہ صحیح مذہب کی بنیاد خدا کی توحید پر ہے۔ اگر بقول مارکس اس دور میں توحید ماننے کی ضرورت نہیں کہ فطرت پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اور اس نے خوف دور کیا تو کیا اس دور میں خدا پر قابو پا لیا گیا کہ اس سے خوف نہ کیا جائے یا یہ کہ اس دور میں اسکی قدرت کی وسعت اور زیادہ منکشف ہوئی کہ کائنات میں اس نے نہایت حکیمانہ قوانین وضوابط رکھے ہیں جن کی وجہ سے سائنس ظہور میں آئی کیونکہ سائنس دریافت قوانین قدرت کا نام ہے۔ اور کیا چودہ سو سال قبل جب اسلام نے توحید باری تعالیٰ پھیلائی اور بے شمار معبودانِ باطل کا خوف زائل کیا تو اس وقت فطرت پر قابو پا لیا گیا تھا۔؟ اگر نہیں تو فطرت پر قابو پا لینے کو ازالہ خوف میں مؤثر سمجھنا غلط ثابت ہوا۔ نیز مادہ اور اسکی حرکت کو ازلی سمجھنا جو مادہ پرستوں کا مذہب ہے یہ کس خوف کا نتیجہ ہے۔ شرکی مذاہب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کے خوف سے شرک اختیار کیا لیکن جب اسلام نے کروڑوں انسانوں کے شرک کو مٹایا اور صرف اللہ کے خوف کو قائم رکھا تو انہوں نے ازالہ خوف تبلیغ اسلام سے کیا یا فطرت پر قابو پانے سے۔

۳۔ فکر | مسئلہ اضداد جس کو آج کی اصطلاح میں جدلیات بھی کہتے ہیں، مارکس کہتا ہے کہ ہر نظام زندگی ہر تصور، ہر مادی شئے، اور معاشرتی حالت اپنے اندر ایک ضد کی پرورش کرتی ہے جو ایک خاص وقت پر ظاہر ہو کر اس سے متصادم ہوتی ہے اور اس تصادم سے ایک نیا نظام نیا تصور نئی مادی شئے یا نئی معاشرتی حالت پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہر شئے دو متضاد حقیقتوں یا متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے مثلاً ایک لکڑی سخت ہے کہ اس پر چیز رکھی جا سکتی ہے، اور نرم بھی کہ اس میں میخ ٹھونکی جا سکتی ہے۔ یہ فلسفہ اضداد ہیگل سے ماخوذ ہے۔

۳۔ تنقید | ان دونوں فلسفیوں نے اضداد کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ دو چیزوں میں فرق اور چیز ہے اور تضاد اور چیز ہے۔ انجینئرنگ اور ایگریکلچر میں فرق ہے۔ لیکن تضاد نہیں۔ خود اطالوی فلسفی نے بھی فلسفہ اضداد کی تردید کی جس کا نام کروس ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ان دونوں نے دو چیزوں کے فرق کو تضاد سمجھا ہے۔ جو غلط ہے۔ مذہب، آرٹ اور فلسفہ میں

فرق ہے۔ لیکن آپس میں ضد نہیں ، جن تصورات کو ایک دوسرے کا ضد قرار دیا جاتا ہے ، وہ ایک اصل کے دو فرع ہیں ، اور ایک دوسرے کے مکمل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر نظام زندگی اپنی ضد کی پرورش کرتا ہے جو ایک خاص وقت پر ظاہر ہو کر اس سے متصادم ہوتی ہے ، جس سے نیا نظام پیدا ہو جاتا ہے ، اصولی طور پر اس میں ایک غلطی تو یہ ہے کہ اگر جدید نظام کی پیدائش اضداد کے تصادم کا ایک طبعی نتیجہ ہے ، تو اشتراکی نظام نے مسئلہ اضداد کے تحت خود بخود پیدا ہونا تھا تو اس کے لئے کروڑوں انسانوں کی تباہی اور جدوجہد کی کیا ضرورت تھی ، اس خاص وقت کا کیوں انتظار نہیں کیا گیا جس سے مسئلہ اضداد کے تحت پر امن طریقے سے نظام اشتراک پیدا ہوتا جبکہ مسئلہ اضداد کے اصول کے تحت وہ اس خاص وقت سے پہلے پیدا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایک بچہ شکم مادر سے مقررہ وقت پر پیدا ہوتا ہے تو اس میں ہنگامے برپا کرنے کی کیا ضرورت۔؟ دوسری غلطی یہ ہے کہ اگر مارکس کا نظریہ درست ہے تو ہر نظام کی طرح اشتراکی نظام بھی اپنی ضد کی پرورش کرتا ہو گا۔ پھر مستقبل میں ایک نیا مختلف نظام تصادم اضداد سے پیدا ہو گا ، جس سے یہ ثابت ہوا کہ ہر نظام کی طرح تصادم اضداد کے قانون کے تحت اشتراکی نظام بھی کوئی مستقل نظام نہیں۔ اس کو ختم ہونا ہے۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ جب ہر نظام ہر تصور اور ہر مادی چیز قانون اضداد کا قدرتی نتیجہ ہے تو انسانی سعی و عمل و جدوجہد محض بیکار اور لغو ہے ، ان تین غلطیوں سے معلوم ہوا کہ مارکس اس نظریہ میں تضاد کا شکار ہوا ہے اور متضاد راہوں پر گامزن ہے۔ چوتھی غلطی یہ ہے کہ ان دو فلسفیوں کا یہ کہنا کہ ہر مادی شئے اپنی ضد کی پرورش کرتی ہے بالکل غلط ہے۔ فلسفہ کے لحاظ سے مادی شئے جوہر اور قائم بالذات ہوتی ہے ، اور جوہری اشیاء میں تضاد نا ممکن ہے ، کیونکہ تضاد اوصاف اور عرضی اشیاء میں ہوتا ہے ، مثلاً سیاہی سفیدی کی ضد ہے۔ وہ دونوں بیک وقت ایک ہی چیز کے ساتھ قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن مادی اور جوہری چیزیں کسی دوسری چیز سے قائم نہیں۔ بذات خود قائم ہیں۔ ان میں تضاد نہیں۔ پانچویں غلطی یہ ہے کہ سختی و نرمی کی جو مثال دی گئی ہے کہ لکڑی میں دونوں جمع ہیں بالکل غلط ہے ، اولاً اس وجہ سے کہ اگر وہ ضد ہوتی تو جمع ہونا دو ضدوں کا ایک محل میں ممکن نہیں ، جیسے گرمی و سردی۔ دوم اس وجہ سے کہ لکڑی نہ لوہے کی طرح سخت ہے نہ پانی کی طرح نرم۔ بلکہ سخت چیزوں کی درمیانی قسم ہے۔ سخت چیز کی تین قسمیں ہیں۔ ۱۔ اعلیٰ جس میں

میخ کو نہ ٹھونکا جا سکے، اگر ٹھونکی جائے تو ٹوٹ جاتی ہے اور آگ سے بھی نرم نہ ہو سکے۔ جیسے پتھر۔ دوم وہ کہ میخ اس میں ٹھونکی جا سکتی ہے مگر تکلیف کے ساتھ اور وہ آگ سے نرم ہو سکے۔ جیسے لوہا۔ اور تیسری قسم جو درمیانی ہے کہ میخ اس میں آسانی کے ساتھ گھس سکے وہ لکڑی ہے، لہذا اس میں نرمی کا تصوّر غلط ہے، بلکہ وہ سخت اشیاء کی ایک قسم ہے یہ صاف تضاد بیانی ہے۔

۴۔ فلسفہ | مارکس کہتا ہے کہ مادہ ازلی ہے اور اس کا وجود ہی ہمارے ادراک و شعور پر موقوف نہیں اور کائنات کے جملہ مظاہر مادہ کی حرکت کے اثرات ہیں۔

۴۔ تنقید | اس میں تضاد ہے کیونکہ اشتراکیت کا انکارِ خدا اس اصول پر مبنی ہے کہ وہ ہمارے شعور سے خارج ہے اور تجربات اور مشاہدات کے دائرے سے باہر ہے تو جب مادہ بھی ادراک و شعور کے دائرے سے باہر ہے تو اس کو کیونکر تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ آثارِ مادہ سے ہم نے استدلال کیا تو کیا یہی استدلال آثارِ قدرتِ الٰہی سے خدا کے وجود پر نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کائناتِ عالم کو مادہ اور حرکتِ مادہ کی طرف منسوب کرنا اور خدا کی طرف منسوب نہ کرنا اس لئے نامعقول ہے کہ کائنات میں حیات بھی موجود ہے مثلاً انسان وغیرہ میں اور مادہ بالاتفاق حیات اور زندگی سے خالی ہے تو منفی سے مثبت اور غیر زندہ مادہ سے زندگی کسطرح وجود میں آئی جب کہ مثبت ہی سے مثبت پیدا ہوتا ہے مثلاً کوئلہ اور لکڑی میں آگ موجود ہے تو اس سے آگ وجود میں آسکتی ہے، لیکن راکھ اور خاکستر میں آگ موجود نہیں تو اس سے آگ ظہور میں نہیں آسکتی اس لئے مادہ کی طرف زندگی اور زندہ اشیاء کو منسوب کرنا خلافِ عقل ہے۔ معقول یہ ہے کہ زندہ ذات یعنی رب العالمین کی طرف عالم کو منسوب کیا جائے۔ جب تم نے مردہ چیز کو خدا کا مقام دیا ہے تو پھر زندہ خدا کو ماننے سے کیوں گریز کیا جاتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ کائنات کا نظام پُر حکمت ہے اور وہ نہایت حکیمانہ قوانین پر مشتمل ہے، جس کو وقتاً فوقتاً سائنسی تجربات سے ہم معلوم کرتے ہیں تو کیا ایسا نظام خدائے علیم و حکیم کی طرف منسوب کرنا معقول ہے یا اس مردہ اور بے جان مادہ کی طرف جو علم و حکمت اور شعور تک سے خالی اور محروم ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ عالم کے اندر ایک معقول ترتیب ہے۔ انسانی اعضاء کے کل پرزے باہمدگر مرتب ہیں اگر اس ترتیب میں ذرہ برابر فرق پڑ جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور اسکی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح حیوان نباتات میں بھی ترتیب ہے یہ علم الحیوانات اور علم النباتات میں واضح کی گئی ہے اور ستاروں اور سیاروں میں بھی ترتیب ہے۔ یہ ترتیب علم و حکمت کے بغیر اتفاقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ جدید کا اتفاق ہے کہ اگر کاغذ کے مساوی سائز کے ٹکڑے کاٹے جائیں اور ایک پر ایک کا ہندسہ لکھا جائے اور دوسرے ٹکڑے پر دو کا، تیسرے پر تین کا، دس تک، اور اس کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک اندھے آدمی کو دیا جائے یا کسی ان پڑھ کو دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ تم اس میں سے ایک ایک ٹکڑہ نکالتے جاؤ تو اگر وہ کاغذ کے ان ٹکڑوں کے نکالنے کا عمل اربوں سال تک کرتا جائے تو بالترتیب ایک سے دس پرزوں کے نکالنے کی نوبت نہیں آئے گی، تو عالم کائنات کی یہ عظیم ترتیب اندھے اور بے سمجھ مادہ سے اتفاقی طور پر کیونکر وجود میں آئی۔ اسی کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا: صنع اللہ الذی اتقن کل شیء۔ کائنات اسی خدا کی کاریگری ہے جس نے مضبوط ترتیب ہر چیز میں قائم کر رکھی ہے، اسی وجہ سے ڈیلو ٹمارک ریزک نیوٹن کہتا ہے کہ موجودہ ترتیب عالم ایک ذات علیم و قدیر کے بغیر ممکن نہیں۔ ہربرٹ سپنسر کہتا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ انسان کے اوپر ایک علم و حکمت والی ازلی ابدی قوت موجود ہے۔ فیل فلاریان کہتا ہے کہ تمام فلاسفر اس بات کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ وجود کیونکر آیا اور کیونکر اس نے ترقی کی۔ لہذا وہ ذات خالق کے اقرار پر مجبور ہیں۔۔۔ نوتل انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ اللہ کی ہستی کا علم واضح اور بدیہی ہے۔

پانچویں غلطی یہ ہے کہ مادہ اشیاء خود بخود کوئی خاص صورت اور شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تک ایک ماہر اور صاحب علم شخصیت اس میں تصرف نہ کر دے۔ سائنسی مصنوعات جدیدہ مادے کی مختلف شکلیں ہیں۔ کیا یہ شکلیں مادہ سے خود بخود وجود میں آئیں یا ماہرین فن کے فعل و عمل سے۔ اسی طرح کائنات کا عظیم مصنوع کے وجود میں آنے کے لئے بھی ایک ماہر ذات کی ضرورت ہے اور وہ خدا ہے۔

چھٹی غلطی یہ ہے کہ تجربات اور مشاہدات میں خدا کا نہ پایا جانا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔ عدم علم اور چیز ہے اور علم عدم اور، خود مادہ جو تحقیق کی رو سے برق پاروں کا نام ہے۔

اس کو اور اس کے خواص کو ہم نہیں جانتے، حیات اور زندگی اور روح کے باطنی صفات کو ہم مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں لاسکتے اور پھر بھی ہم ان کے وجود کا اقرار کرتے ہیں۔

ساتویں غلطی یہ ہے کہ مادہ کل کمالات میں خود انسان سے کم درجے کی چیز ہے، اور انسان اشرف المخلوقات ہے تو پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کمتر چیز کو تخلیقِ کائنات منسوب ہو اور انسان اشرف کو منسوب نہ ہو۔

آٹھویں غلطی یہ ہے کہ انسان آخری ترقی یافتہ مخلوق ہے اس کی ترقی اور ذہنی اور فکری ارتقار کے لئے ایک ایسی ہستی کا وجود ضروری ہے، جو اس کی ترقی اور بلند خیالی کے لئے نمونہ بن سکے، جیسے کم کمال رکھنے والا ہمیشہ اپنے سے بڑے باکمال ہستی کے نمونہ کو دیکھ کر اسکی نقل اتارنے اور اس سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ایسی ذات خدا کا وجود ہو سکتا ہے۔ نہ مردہ بے جان اور بے سمجھ مادے کا۔

نویں غلطی یہ ہے کہ انسانی اصلاح اور درستی کے لئے ایسی ذات کا یقین ضروری ہے کہ اس کے کمال اور قدرت اور عدل حکمت وجلال میں اس کی کوئی نظیر نہ ہو، تاکہ اس ذات کی دلوں کے باطن پر عظمت وحکومت برائی سے مانع اور بھلائی پر ابھارنے والی ہو۔

دسویں غلطی یہ ہے کہ دنیا میں ضعیف اور کمزور افراد کی تعداد زیادہ ہے اور غالب اور قوی اور با اقتدار لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ عالم اسباب میں ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کے لئے کوئی سہارا نہیں ہوتا جس سے ان کی یاس اور ناامیدی آس اور امید میں بدل جائے اور ان کے دلوں کے لئے قوت اور اطمینان کا سامان ہو۔ یہ فطری ضرورت خدائے قادر مطلق اور علیم اور خبیر کی ذات پر یقین کرنے سے پوری ہو سکتی ہے، نہ مردہ اور عاجز مادہ کی تسلیم سے۔ اس لئے خدا کی ضرورت عقلی بھی ہے فلسفی بھی ہے، اور فطری بھی ہے اور اصلاحی اور ارتقائی بھی۔

۵۔ فکر | مارکس کہتا ہے کہ کوئی صداقت ابدی نہیں بلکہ حالات کی تابع ہے، حالات جب بدل جاتے ہیں، تو صداقت بھی بدل جاتی ہے، اس لئے کوئی صداقت ہمیشہ کے لئے صداقت نہیں، احوال حرکت مادہ کے نتائج ہیں، جو تغیر پذیر ہیں، تو صداقت بھی تغیر پذیر ہے۔ وحی کے متعلق کہتا ہے کہ انسان کی اندرونی قوت کے سوا کوئی اور ذریعہ علم نہیں۔ اس لئے وحی کا افسانہ غلط ہے۔

۵۔ تنقید | اگر کوئی صداقت ابدی نہیں تو اشتراکیت کی صداقت اور مادہ اور مادہ کی حرکت

کی صداقت بھی ابدی نہیں۔ جب احوال بدل جائیں گے تو یہ دونوں صداقتیں بھی ختم ہوں گی اور اگر یہ ختم نہ ہو گی تو یہ تضاد اور تناقض ہے ۔۔۔ اور کیا ظلم کی برائی اور انصاف کی بھلائی ابدی نہیں اور اس طویل عرصے میں سب احوال کی تبدیلی سے وہ کیوں نہیں بدلے ؟ درحقیقت ابدی صداقتوں کا انکار کوئی معقول نظریہ نہیں بلکہ یہ مادیت کا لازمی نتیجہ ہے جب مادہ پرستوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کائنات فطرت اور انسانی تاریخ کے واقعات حرکت مادہ کے ناگزیر نتائج ہیں اور مادی مقاصد ہی سب کچھ ہے، تو اس خیال سے خود بخود ضابطۂ اخلاق اور ابدی صداقتوں کا انکار لازم آتا ہے تاکہ مادی فوائد کے حصول کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ باقی وحی کا انکار تو اس لیئے غلط ہے کہ وحی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں روح مطلق یعنی خالق کائنات کی طرف سے الفاظ اور مطالب کا القاء ہو خدا کے ثبوت میں دلائل پہلے بیان ہو گئے ہیں، اب اس کی طرف سے کسی منتخب ذات کے دل و دماغ میں کسی علم کا منتقل کر دینا یہ وحی ہے جو بوجوہات ذیل درست ہے۔

۱۔ بہت سے حیوانات مثلاً چیونٹی، شہد کی مکھی، عنکبوت یا مکڑی کے متعلق جدید تحقیقات نے ایسے علوم بیان کئے ہیں جن کو معلوم کر کے انسان حیران ہو جاتا ہے۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں اب ان علوم کا ان حیوانات کو حاصل ہونا کسی تعلیمی مروج طریقے سے ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ نہ وہ کسی اسکول میں داخل ہوئے نہ کوئی کتاب پڑھی، نہ انہوں نے کسی استاذ سے استفادہ کیا تو ظاہر ہے کہ ان کو یہ علوم غیر معروف طریقے یعنی الہام ربانی سے حاصل ہوئے۔ واوحینا الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا۔ (قرآن) یعنی ہم نے الہام سے شہد کی مکھی کو سمجھایا کہ تم پہاڑوں میں اس خاص طریقے سے شہد کا چھتہ بناؤ جب حیوانات میں علم کا خارجی ذریعہ موجود ہے تو کیا انسانوں میں مخصوص حضرات انبیاء علیہم السلام کو خارجی قوت یعنی ذات رب العالمین بذریعہ وحی علوم منتقل نہیں کر سکتی۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مصنوعات جدیدہ بھی الہام الٰہی کا نتیجہ ہے۔ مثلاً سب سے پہلے جس موجد نے ہوائی جہاز کی مشین کو بنانا چاہا اور وہ مشین اب تک بنی نہیں تھی اسلئے اس کے تجربات و مشاہدات سے اس کا صحیح نقشہ خارج تھا۔ اس نے یقیناً اس نقشہ کی طرف اپنے ذہن کو متوجہ کیا ہو گا۔ لیکن موجد کا کام صرف طلب ہے اور فکر و ذہن کو متوجہ کرنا ہے۔ ٹھیک نقشہ کا دفعتہً یا بعد از تجربہ ذہن میں آنا یہ الہام ربانی سے ہوتا ہے۔

قرآن نے یہی بیان کیا۔ کلا نمدّ ہولاء وہولاء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظورا۔ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں جس چیز کو طلب کرے تو ہم ان کو امداد دیتے ہیں اور تمہارے رب کی امداد کسی سے بند نہیں، یہ امداد وہ الہام الٰہی ہے جس سے اس چیز کا نقشہ اس کے دماغ میں ڈال دیا جاتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

۳۔ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ انسان ایک بے جان آلہ میں ایک شخص کے الفاظ اور تقریر کو منتقل کرکے محفوظ کرسکتا ہے۔ تو کیا خالق کائنات کے لئے یہ مشکل ہے کہ الفاظ وحی مثلاً قرآن کسی برگزیدہ رسول کے ذہن میں بے جان آلہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ایک جاندار ملکی قوت کے ذریعہ منتقل کردے۔

مولانا سمیع الحق صاحب مدرس دار العلوم حقانیہ و مدیر ماہنامہ الحق ۲۶ ذیقعدہ کو سفر حج و زیارت پر گئے ہیں، ان کے نام جو ڈاک آرہی ہے ان سے متعلقہ امور کا جواب انکی واپسی پر دیا جاسکے گا۔ البتہ دفتر سے متعلق امور پر ہم پوری کاروائی کرتے رہیں گے۔

(صابر علی شاہ۔ منیجر الحق)

جناب باری عز اسمہ کی وہ صفات جو کہ مقتضی معبودیت ہیں، ان کا مرجع دو باتوں کی طرف ہوتا ہے، اول مالکیت نفع وضرر، دوئم محبوبیت۔ اول کو جلال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور ثانی کو جمال سے، مگر یہ تعبیر ناقص ہے، جلال محض مالکیت ضرر پر متفرع ہوتا ہے، جس طرح جمال اسباب محبوبیت میں سے ایک سبب ہے، وجوہ محبوبیت علاوہ جمال کے کمال قرب احسان بھی ہیں، سبب اول یعنی مالکیت نفع وضرر کا اقتضا معبودیت حدود عقل میں رہ کر ہونا ضروری ہے، اس معبودیت میں عابد کی ذاتی غرض چونکہ باعث عبادت ہوتی ہے، یعنی طمع یا خوف یا دونوں، اس لئے یہ عبادت اس قدر کامل نہ ہوگی جس قدر وہ عبادت جس میں محض ارضاء معبودیت مقصود ہو، ظاہر ہے کہ محبوب کی جو کچھ طاعت اور فرمانبرداری کی جاتی ہے، اس سے محض اسکی رضا مطلوب ہوتی ہے، لہٰذا ضروری تھا کہ دونوں قسموں کی عبادتیں دین کامل میں ملحوظ ہوں، قسم اول پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول نماز و زکوٰۃ ہیں اور قسم ثانی پر متفرع ہونے والی عبادتوں میں اصل الاصول روزہ اور حج ہیں۔ روزہ محبوبیت کی منزل اول اور حج منزل ثانی ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عاشق پر اولین فریضہ یہی ہے کہ اغیار سے قطع تعلق کیا جائے جو کہ روزہ میں ملحوظ رکھا گیا ہے، دن کو اگر صیام کا حکم ہے تو رات کو قیام کا، اور آخر میں اعتکاف نے اگر رہے سہے تعلقات کا بھی خاتمہ کر دیا، بحکم مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ اور من قام رمضان ایماناً۔ (الحدیث) اگر استیعاب صوم رمضان کا پتہ چلتا ہے تو بحکم احییٰ لیلہ ومن صام رمضان (الحدیث) وغیرہ استیعاب قیام رمضان کا بھی پتہ چلنا ضروری ہے۔ اور چونکہ کمال صومی کے لئے محض

بالوفات ثلاثہ کا جو کہ اصل الاصول ہیں، ترک مطلوب نہیں، بلکہ ان کے علاوہ معاصی اور مشتہیات نفسانیہ کا ترک بھی مقصود ہے۔ من لم یدع قول الزور۔ (الحدیث) اور رب صائم لیس لہ من صومہ الا الجوع (الحدیث) اس کے شاہد عدل ہیں۔ جب ترک اغیار کا اثبات (جو کہ منزل عشق کی پہلی گھاٹی ہے) ہو گیا، اس کے بعد ضروری ہے کہ دوسری منزل کی طرف قدم بڑھایا جاوے، یعنی کوچہ محبوب اور اس کے دار و دیار کی جبہ سائی کا فخر حاصل کیا جاوے، اس لئے ایام صیام کے ختم ہوتے ہی ایام حج کی ابتدا ہوتی ہے۔ جنکا اختتام ایام نحر (قربانی) پر ہے، کوچۂ محبوب کی طرف عاشق کا سفر کرنا جس نے تمام اغیار کو ترک کر دیا ہو اور سچے عشق کا مدعی ہو، معمولی طریقہ پر نہ ہوگا، نہ اس کو سر کی خبر ہوگی نہ پیر کی۔ نہ بدن کے زیب و زینت کا خیال ہوگا نہ لوگوں سے جھگڑا اور لڑنے کا ذکر۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ۔ کہاں عشق اور کہاں آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں کہاں قلبی اضطراب اور کہاں شہوت پرستی اور آرام طلبی، نہ سرمہ کی فکر ہوگی نہ خوشبو اور تیل کا دھیان، اس کو آبادی سے نفرت، جنگل اور جنگلی جانوروں سے الفت ہونی ضروری ہے۔ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔ سیر و شکار جو کہ کار بیکاراں ہے، ایسے عشاق اور مضطر نفوس کے لئے بعید نفرت کی چیز ہوگی۔ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا۔ اس کی تو دن رات کی سرگرمی معشوق کی یاد، اس کے نام کو جپنا، اپنے تن بدن کو بھلا دینا دوست احباب، عزیز و اقارب، راحت و آرام کو ترک کر دینا، نہ خواب آنکھوں میں بھلی معلوم ہوگی، نہ لذائذ اطعمہ اور خوشبو دار اور خوش ذائقہ اشربہ والبسہ کا شوق ہوگا ؎

یداری ھواہ ثم یکتم سرہ ویخشع فی کل الامور ویخضع

وہ اسکی محبت خوش اسلوبی سے نباہتا رہتا ہے، پھر اس کے راز پر پردہ پوشی کرتا رہتا ہے اور تمام حالات میں مطیع و فرمانبردار رہتا ہے۔

جوں جوں دیار محبوب اور ایام وصال کی قربت ہوتی جائے گی، اسی قدر ولولہ اور فریفتگی اور جوش جنون میں ترقی ہوتی رہے گی ؎

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

؎ ان دنوں جوشِ جنوں ہے ترے دیوانے کو لوگ ہر سو سے چلے آتے ہیں سمجھانے کو

خونِ دل پینے کو اور لختِ جگر کھانے کو یہ غذا دیتے ہیں جاناں ترے دیوانے کو

؎ نو بہار است جنوں چاک گریباں طلبد آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

قریب پہنچتے ہیں (میقات پر) تو اپنے رہے سہے میلے کچیلے کپڑوں کو پھینک دیتے ہیں، اس

وادیٔ عشق میں گریباں اور دامن سے کیا کام ؎

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک اس کو سیا سیا نہ سیا پھر کسی کو کیا

دن و رات محبوب کی رٹ پپیہا کی طرح لگی ہوتی ہے۔ (تلیہ پڑھ رہے ہیں) ؎

رٹت پھرے پیو پیو کنارے ہمرے پیا تو بدیس سدھارے

برہا بروگ سے تلپت جیہ اب جن بول پپیہا پیو

اگر غم ہے تو محبوب کا، اگر ذکر ہے تو معشوق کا، اگر طلب ہے تو پیو کا۔ اگر خیال ہے تو دلبر کا ؎

عشق میں تیرے کوہ غم سر پہ لیا جو ہو سو ہو عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا جو ہو سو ہو

کوچۂ محبوب میں پہنچتے ہیں تو اس کی در و دیوار کے ارد گرد پوری فریفتگی کے ساتھ چکر لگاتے ہیں۔ چوکھٹ پر سر ہے تو کہیں دیواروں اور پتھروں پر لب ؎

أمر علی الدیار دیار لیلی أقبل ذا الجدار و ذا الجدارا[1]

وما حب الدیار شغفن قلبی ولکن حب من سکن الدیارا

کسی نے اگر جھوٹی سی خبر دی کہ معشوق کا جلوہ فلاں جگہ نمودار ہونے والا ہے تو بے سر و پیر ہو کر دوڑتے وہاں پہنچے، نہ کانٹوں کا خیال ہے، نہ راستے کے پتھروں کی فکر ہے، نہ گڑھوں میں گرنے کا سوز ہے، نہ پہاڑوں کی سختیوں کا ڈر ہے۔ مجنون بنی عامر کا ساں بندھا ہوا ہے، بدن میں اگر جوں ڈھیروں پڑی ہیں تو کیا پروا ہے، اہل عقل اور اہل زمانہ اگر پھبتیاں اڑاتے ہیں تو کیا شرم ہے ؎

جب پیت بھئی تب لاج کہاں سنسار ہنسے تو کیا ڈر ہے

دکھ درد پڑے تو کیا چنتا اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے

اگر ناصح ناداں معشوق و عشق سے روکتا ہے۔ تو جس طرح آگ پر پانی کے چھینٹے اسکو اور بھڑکا دیتے ہیں اسی طرح آتش عشق اور بھڑک جاتی ہے، ناداں ناصح کو پتھر مارتے ہوئے اپنے آپ کو قربان کر دینے کے لئے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ ع

ناصحا مت کر نصیحت دل مرا گھبرائے ہے

---

[1] مجنوں کہتا ہے کہ میں لیلی کے کوچہ پر گذرتا ہوں، تو کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں اور کبھی اس دیوار کو، میرے دل میں دراصل کوچہ کے در و دیوار نے کوئی جگہ نہیں بنائی ہے۔ بلکہ اس گلی کے رہنے والی نے۔

وبھجتی یا عاذلی الملک الذی   اسخطت کل الناس فی ارضائہ

اے ملامت گر میری جان اس بادشاہ پہ قربان ہے کہ جسکے راضی رکھنے کی غرض سے میں نے تمام لوگوں کو ناخوش کر دیا ہے۔

لومن احب لاعصینک فی الھوی   قسما بہ و بحسنہ و بھائہ

اے ملامت گر میں محبوب کے حسن و جمال کی قسم کھاتا ہوں کہ محبت کے بارے میں ضرور تیری نافرمانی کروں گا۔ (متنبی)

میرے محترم! یہ تھوڑا سا خاکہ حج اور عمرہ کا ہے، اگر دل میں تڑپ اور سینہ میں درد نہ ہو تو زندگی ہیچ ہے، وہ انسان ہی انسان نہیں جسکے دل و دماغ، روح، اعضاء رئیسہ محبوب حقیقی کے عشق اور ولولہ سے خالی ہیں، یہاں عقل کے ہوش گم ہیں، جس قدر بھی بے عقلی اور شورش ہوگی اور جسقدر بھی اضطراب اور بے چینی ہوگی، اسی قدر یہاں کمال شمار کیا جائے گا۔

سوختہ جان در دانان دیگر اند   موسیا آداب دانان دیگر اند

ذرۂ درد ت دل عطار را   کفر کافر را و دین دیندار را

عقل وحیا کے مقید ہونے والے عشاق آرام اور راحت کے طلبگار محبین اپنی سچائی کے اثبات سے عاجز ہیں۔

عشق چوں خام است باشد لبستۂ ناموس و ننگ

پختہ مغزان جنوں را کے حیا زنجیر پا است

اس وادی میں قدم رکھنے والے کو سرفروشی اور ہر قسم کی قربانی کیلئے پہلے سے تیار رہنا ضروری ہے، آرام اور راحت، عزت اور جاہ کا خیال بھی اس راہ سخت ترین میں بدنام کرنے والا گناہ ہے۔

عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد   نازپروردہ تنعم نہ بردراہ بدوست

بدست سر بریدہ می دہد جام   یقین می داں کہ آں شاہ نکو نام

مولانا المحترم! اس وادی پرخار میں قدم رکھتے ہیں، اور پھر تلی کا، سر کے چکر کا، بیماری کا، ضعف کا، تکلیف کا، عزت وجاہ کا فکر ہے۔ افسوس ہے، مردانہ وار قدم بڑھائیے، اگر تکلیف سامنے ہو تو خوش قسمتی سمجھئے، اگر ستائے جائیں تو محبوب کی عنایت جانئے، پس پردہ طوطی صفت کون گرا رہا ہے، مجنوں کو لیلی کے کاسہ توڑ دینے پر رقص ہوتا ہے، جس سے وہ

باقی ص۵۱ پر

جناب مصطفےٰ احسن فردوسی ۔ ڈھاکہ

مولانا محمد علی جوہرؒ کے ساتھ سیاسی بے انصافی

جس طرح چاند کہنے سے چاندنی کا تصور، پہاڑ کہنے سے بلندی کا خیال، آفتاب کہنے سے اسکی تمازت کا احساس دل میں آنا ضروری ہے، اسی طرح انڈیا اور پاکستان کی جنگ آزادی کا نام لیتے ہی سے چند شخصیتوں اور ان کے کارناموں کا خیال ذہن میں لازمی طور پر آتا ہے، انہیں چند ہستیوں میں مولانا محمد علی جوہر کی ایک ہستی ہے، وہ جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔ جس کے کردار کو ہٹا لینے کے بعد پوری کہانی خشک اور بے حقیقت سی ہو کر رہ جائے گی۔ اس کے باوجود بھی ان کے معاملہ میں جنگ آزادی پر کتاب لکھنے والوں نے جو اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دیا ہے، وہ بڑا اثرناک ہے۔

آزادی کی جدوجہد برصغیر ہندو پاکستان میں جنگ آزادی کی کہانی بڑی پرانی ہے۔ دراصل ۱۷۵۷ء ہی سے شروع ہوئی جب کہ بنگال میں انگریزوں نے سازش اور نواب سراج الدولہ کے خاص خاص معتمدوں کو غداری پر آمادہ کرکے جنگ پلاسی میں فتح حاصل کی۔ شروع دور میں تو اجتماعی حیثیت سے عوام نے غیر منظم طور پر ادھر ادھر چند بار کوششیں کیں، لیکن زنگیوں کی منظم اقلیت کے سامنے بھاری اکثریت مگر غیر منظم ہندوستانیوں کی کچھ چل ہی نہ سکی، جہاں کامیابی کے امکان روشن تھے اور جہاں انگریزوں کو سخت مقابلہ کا خدشہ تھا، وہاں انہوں نے غداروں کا سہارا لیا اور ملت فروشوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر حریت پسندوں کی کوششوں پر جبر و استبداد کی مہر لگا دی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ایک عرصہ تک تو خاموشی رہی۔ اس لئے کہ انگریزوں نے جس طرح قتل عام

کے ذریعہ عوام کو خوفزدہ کر رکھا تھا، اس کے پیش نظر کوئی رہنمائی کے لئے آگے آتا ہی نہیں تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد نئے حالات اور نئے رجحانات کے ماتحت آزادی پسندوں نے کام شروع کیا اور آخر کار ایک مدت کی اکھاڑ پچھاڑ کے بعد آزادی حاصل کر کے رہے۔ اس کشاکش کے دور میں انفرادی شخصیتوں کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ان کی مخلصانہ کوششوں نے منتشر اور شکستہ دل عوام کو منظم اور ان میں اعتماد پیدا کرنے میں بڑا کام انجام دیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد ہندو مسلمان دونوں میں کافی رہی۔ سب والں کا نام آج غلط یا صحیح طور پر انڈیا پاکستان کی تاریخ جنگ آزادی میں لیا جاتا ہے۔ لیکن صرف ایک شخصیت ایسی ہے جو اپنے بے پناہ خلوص اور خدمات کے لحاظ سے صف اولین میں سب سے اونچا درجہ دئے جانے کے لائق ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا کہیں نام نہیں لیا جاتا۔ یہ ہستی مولانا محمد علی جوہر کی ہے۔

محمد علی جوہر کے ساتھ بے انصافی مولانا محمد علی کو گذرے ہوئے آج تیس برس ہو گئے ہیں، لیکن عوام کے دلوں میں ان کا احترام ہنوز باقی ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ ان کا احترام اور ان کی یاد عوام کے دلوں میں سینہ بہ سینہ ایک پشت سے دوسری پشت تک آتی نہ رہے، یہاں تک کہ اس وقت تک باقی رہے جب تک کہ برصغیر ہند و پاک میں ہندوستان کی آزادی کا صحیح قدرداں زندہ ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے شکستہ دل عوام کو جرأت بخشی۔ انہوں نے ان زبانوں کو جن پر ظلم و استبداد کی مہریں لگا دی گئی تھیں، دوبارہ زبان بخشی اور آہنی مہروں کو اپنے جذبہ اور حرارت شوق سے ہمیشہ کے لئے ختم کیا۔ لیکن افسوس کہ اس مجاہد اعظم کا تذکرہ جنگ آزادی کی کتابوں میں نہیں کیا جاتا۔ ہم اس بے انصافی اور بددیانتی کو سیاسی اغراض ایک سانحہ عظیم، ایک شرمناک حرکت کہنے پر حق بجانب ہوں گے۔

آزادی سے متعلق اردو، انگریزی اور ہندی سبھی زبانوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے مولانا محمد علیؒ کے سامنے سیاسی زندگی میں زانوئے ادب تہ کیا۔ اور بہت سے مصنفین ایسے ہیں جنہوں نے ان سے بولنے اور کام کرنے کا طریقہ سیکھا اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان کو آزادی کے کارواں سے آگے چلتے دیکھ کر پیچھے سے راہ لی لیکن اب تک جتنی کتابیں خصوصیت کے ساتھ بھارت میں لکھی گئیں وہ سب کی سب تقریباً تعصب اور بددیانتی کے ساتھ لکھی گئیں۔ ان کتابوں میں اول تو محمد علی مرحوم کا نام ہی نہیں آتا اور کہیں کہیں پر آتا بھی ہے تو اس طرح جیسے محمد علی آزادی کی جنگ میں ایک معمولی حیثیت کے مالک تھے اتنی بڑی شخصیت کے ساتھ اتنی بڑی بے انصافی کیوں کی گئی۔ یہ ایک سربستہ راز معلوم ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی

... مولانا محمد علی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" (INDIA WINS FREEDOM) میں کچھ تذکرہ نہیں کیا۔ صرف صفحہ نو اور دس میں مولانا محمد علی کا نام آتا ہے، وہ بھی فرنگی محل کے مولوی باری صاحب کے توسط سے آتا ہے، ورنہ محمد علی کے نام سے ... زیادہ تذکرہ حکیم اجمل خاں، لالہ لاجپت رائے، سی۔ آر۔ داس اور بپن چندرپال، وغیرہ جیسی ... ڈلائن آف ڈیفنس کی شخصیتوں کا ہے۔

انڈیا ونس فریڈم میں تذکرہ نہیں | "انڈیا ونس فریڈم" کا حجم ڈھائی سو صفحہ پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد مرحوم نے اس کتاب میں اپنی خاندانی وراثت اور بچپن سے لے کر تقریباً اپنی زندگی کے آخری پہلو تک تمام موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان موضوعات میں ایسے بھی موضوع ہیں جنہیں صحیح معنوں میں ہندوستان ... آزادی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ گھر کی باتیں ہیں جنہیں گھر ہی کے ماحول تک رہنا چاہیے تھا۔ کتاب کی ... تفصیل کے باوجود بھی اس میں مولانا محمد علی کی خدمات کا کہیں اعتراف نہیں ملتا، حالانکہ پنڈت نہرو ... اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" (DISCOVERY OF INDIA) میں صفحہ ۳۵۲ میں اس بات کا اقرار ... کیا ہے کہ مولانا نے خلافت کی تحریک اور کانگریس پارٹی کے بنانے میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ مولانا کافی عرصہ تک کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے سب سے اعلیٰ رکن کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے، گاندھی جی جنہیں مولانا محمد علی جوہرؒ نے صحیح معنوں میں جنگ آزادی کے پلیٹ فارم پر لاکر انہیں مسلمانوں سے متعارف کرایا اور ان کے ارادے اور طریقہ کار میں ایک نئی جان پیدا کی۔ ان کا تذکرہ اس کتاب میں ملتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ بھارت کی آزادی کی تاریخ مکمل ہی نہیں کہی جاسکتی ہے۔ جب تک کہ گاندھی جی جیسے حریت پسند کا تذکرہ نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ ایک منصف مزاج انسان یہی کہے گا کہ آزادی کی تاریخ بلاشبہ اس وقت تک بھی مکمل نہیں کہی جاسکتی۔ جب تک کہ ... میں محمد علی جوہرؒ کی بے لوث خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتے۔

طفیل احمد منگلوری کی طرف سے زیادتی | اسی قسم کی ۱۹۳۹ء میں ایک کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے نام سے طفیل احمد منگلوری نے لکھی۔ مولانا آزادؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جیسی شخصیتوں نے اس کتاب کے متعلق رائے بھی ظاہر کی اور یہ لکھا ہے کہ "مسلمانوں کو جو ملک کی سیاسی صورت حال سے ساتھ سمجھنا چاہیتے ہیں۔ میں مشورہ دوں گا کہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں"۔ اس کتاب میں ۶۲۲ صفحے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب "بنیادی حقوق پر ایک نظر" سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس کا اختتام "بنیادی حقوق کا محاسبہ" پر ہوتا ہے۔ درمیان میں مسلمانوں کی

حکومت، ان کے اوصاف وفضائل، ان کا انحطاط، انگریزوں کا تسلط اور پھر تحریک آزادی کے تمام پہلوؤں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ دلچسپ تو یہ ہے کہ کتاب میں خلافت کی تحریک کے عنوان سے بھی ایک علیحدہ باب ہے۔ لیکن انتہائی افسوسناک اور حیرت انگیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس باب میں بھی مولانا محمد علی جوہرؒ کا کوئی تذکرہ نہیں، حالانکہ یہ بات ابھی ہر خاص وعام کی زبان پر ہے کہ خلافت کی تحریک کے میر کارواں محمد علی جوہرؒ ہی رہے ہیں۔ انہوں نے اس تحریک میں جان ڈالی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو جگہ دی جا سکتی ہے، مگر ان مصنفوں کے نزدیک مولانا محمد علی کا کوئی مقام نہیں۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ملک کی سیاسی صورت حال جاننے کیلئے اس کتاب کے مطالعہ کی اہمیت تو دی ہے، لیکن کوئی رائے اس پر ظاہر نہیں کی کہ مجاہد اعظم کا تذکرہ اسکی کتاب میں نہ ہونے بغیر یہ کتاب معنوی لحاظ سے نامکمل ہے۔

محمد علی میدان عمل میں | مولانا محمد علی ۱۹۱۱ء کی کہر آلود صبح میں کلکتہ پہنچے، اس وقت وہاں ان کا کوئی جاننا پہچاننا بھی نہیں تھا، معاون تو درکنار، ارادہ یہ تھا کہ قوم خوابیدہ کو صحافت کے ذریعہ جگایا جائے، اخبار کی اشاعت کا کام بذات خود ہی بڑا ہی آلام ومصائب سے بھرا ہوا کام ہے۔ اس پر یہ کہ کوئی مالی تعاون یا ہمت افزائی کرنے والا نہیں۔ اسی وقت انہیں ایک طویل ٹیلیگرام ملا جس میں کہ ایک ریاست کے وزیر اعلیٰ ہونے کی سرکاری دعوت دی گئی تھی۔ اس سے قبل بھی انہیں کئی بار ریاست کے وزیر اعلیٰ بننے کی دعوت دی جا چکی تھی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا تھا۔

ریاستی زندگی کے حکمراں یا حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے جو ٹھاٹھ اس وقت لوگ کیا کرتے اس کا اس وقت تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آج کا وزیر اعظم بھی ویسے افراط زر اور آسائش کی زندگی نہیں گذار سکتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود مولانا محمد علی نے اس ٹیلیگرام کو اس وقت تک نہ کھولا جب تک کہ ان کا کامریڈ اخبار ۱۱ر جنوری ۱۹۱۱ء کو شائع نہ ہو چکا مبادا کہ ٹیلیگرام کے اندر بڑی اور بھرپور دعوت ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ لادے۔ وہ قومی خدمت کی عسرت کی زندگی کو بہترین تو فناتی اور افراط زر کی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔

ان کے ہم عصر جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں میں بھی زیادہ تعداد ایسے ہی لوگوں کی تھی جو روزمرہ کی زندگی میں آرام وآسائش کی زندگی کو پسند کرتے تھے اور ان کے بعد بھی زیادہ تر ایسے ہی لوگ پلیٹ فارم پر آئے جن کا رہن سہن عوام کے رہن سہن سے بالکل مختلف تھا۔ برخلاف اسکے

محمد علی جوہرؒ مرحوم کی زندگی سادہ تھی۔ یہاں تک کہ وہ ہزاروں کے مجمع میں کھڑے تو پھر بغیر صورت سے پہچانے ہوئے انہیں لباس سے کوئی نہیں پہچان سکتا تھا، کہ وہی شخص ہے جس کی ایماء پر مسلمان اپنا مال اور اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتے۔

ایچ۔جی۔ ویلیس کا خراج تحسین | انگریزی کا مشہور و معروف مصنف ایچ۔جی۔ ویلیس مولانا محمد علی کی عظمت ان جملوں میں پیش کرتا ہے:۔

HE HAD THE HEART OF NEPOLEAN, PEN OF MACAULAY AND

TOUNG OF BREEK.

وہ نپولین کا دل، میکالے کا قلم اور برک کی زبان رکھتے تھے۔

ان تینوں شخصیتوں سے تعارف رکھنے والے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایچ۔جی۔ ویلیس کس حد تک مولانا محمد علی کی اعلیٰ صلاحیتوں اور بے پناہ ہمت وجرأت کا معترف ہے، کسی انگریز مصنف نے برصغیر ہندو پاک کی شخصیتوں میں سے اتنا بڑا خراج تحسین کسی کو پیش نہیں کیا۔

عوام ہمیشہ محمد علی کو یاد کریں گے۔ | اب جہاں تک ان کی سیاسی وقومی خدمات کا تعلق کامریڈ کے فائل۔ مولانا محمد علی کی تقریریں اور ان کی تحریریں جو منتشر اوراق میں پھیلی ہوئی ہیں، وہ آنے والی نسلوں کو بتا سکتی ہیں کہ مولانا محمد علی کی شخصیت ایک جنگ آزادی کے مجاہد کی حیثیت سے کتنی بلند اور ارفع تھی۔ وہ لوگ جنہوں نے آپ کو قوم کے خادم کی حیثیت سے پروانہ وار کام کرتے دیکھا ہے، گو آج خال خال ہیں، لیکن پھر بھی جو باقی ہیں وہ ان کی یاد میں ہنوز قوم کی خاطر سرفروشی کے نئے تازہ دم رکھتے تھے۔

غیر ممالک میں محمد علی نے ہندوستان کا تعارف کرایا۔ | ۱۸۵۷ء کے بعد انگلینڈ، امریکہ اور دیگر یورپین ممالک میں جس نے مؤرخوں، ناقدوں، ادیبوں، سیاست دانوں، مقرروں اور عوام الناس کو یہ بتایا کہ ۱۵۰۰ میل لمبی اور ۲۰۰۰ میل چوڑی سرزمین، ہندوستان میں صرف گھاس پھوس نہیں بلکہ آدمیوں کے نوابان انسان بستے ہیں۔ وہ دراصل مولانا محمد علی جوہرؒ کی ذات تھی، ورنہ مسٹر گاندھی ہو یا سی۔آر۔داس یا مولانا ابوالکلام آزاد، کسی کی بھی شخصیت ایسی نہیں تھی جس نے ہندوستان کی آزادی کے نظریہ کو اتنا طور پر اور اس بے باکی سے پیش کیا تھا۔

ہمت وجرأت کی بے پایاں مثال | کراچی میں مولانا محمد علی کے خلاف غداری کا مقدمہ چلایا گیا یہ ۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا، اس مقدمہ کی روئیداد جنہوں نے پڑھی یا سنی ہے، انہیں بخوبی معلوم ہے کہ ا

شخص کا دل ملک وملت کے لئے وقف الم تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے جب آزادی کی کوشش کو بار آور ہوتے نہیں دیکھا تو انہوں نے اپنی زبان سے اللہ کے راستہ میں لوٹ آنے کی دعا کی جو مستجاب ہوئی ہے

اکسیر یہی ایک دعا میرے لئے ہے اللہ ہی کے رستے میں جو موت آئے تو اچھا

بیس سال کی مستقل جدوجہد اور پریشانی کے بعد چوتھی بار مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ نومبر ۱۹۳۰ء کی بات تھی۔ اس وقت آپ کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی۔ ڈاکٹر مسلسل انہیں آرام کے لئے تاکید کر رہے تھے۔ عزیز و اقربا، دوست احباب جتنے تھے سبھوں نے لندن کے سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن آپ نے جواب یہ دیا کہ مجھے تین دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ ۱۔ ذیابیطس، اس سے نمٹ لوں گا۔ ۲۔ حکومت برطانیہ، تو اس سے بخوبی لڑوں گا۔ ۳۔ صرف ایک دشمن ہے، جس کے بارے میں کہہ نہیں سکتا اور وہ موت ہے۔ آپ نے جو کہا تھا وہی ہوا۔ شدید بیماریوں کے بعد بھی آپ لندن پہنچے اور سینٹ جیمس پیلس میں "آزادی یا موت" کے عنوان سے ایک یادگار تقریر کی، جو آج بھی شائقین انگریزی کو یاد ہوگی۔ اس تقریر کا ہر جملہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ آزادی کی جنگ میں مولانا محمد علی کا مقام گاندھی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر مونجے اور مولانا ابوالکلام آزاد سے کہیں بلند تر تھا۔ اس لئے کہ آپ ہندوستان کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے جب کہ گاندھی جی سمیت تمام کانگریسی ممبران اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہندوستان ڈومینین اسٹیٹس ہی مل جائے۔ آپ کی اس آخری تقریر کے چند جملے یہاں درج کئے جاتے ہیں، جس سے قارئین کو ان کی جرأت اور ہمت مردانہ کا اندازہ ہو۔

"مسٹر چیرمین، ہندوستان میں ہم ۳۲ کروڑ کی تعداد میں ہیں، جبکہ ہم لاکھوں لاکھ کی تعداد میں وبا اور قحط میں مر سکتے ہیں، تو بلاشبہ ہم برطانیہ کی گولیوں کو سینوں پر برداشت کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ دنیا میں آج تک کوئی جنگ صرف مارنے کے حوصلے سے نہیں لڑی گئی بلکہ میدان جنگ جیتنے کیلئے مرنے کا بھی حوصلہ رکھتا ہو۔ ہم ہندوستانیوں نے مرنے کا بھی حوصلہ پیدا کیا ہے اور یہ سمجھ لو کہ ۳۲ کروڑ انسان کو گولی کا نشانہ بنانے کی ہمت تم میں نہیں آسکتی۔ کیا تم ۳۲ کروڑ انسانوں کے ہلاک کر دینے کی کوئی مشین بنا سکتے ہو، اگر بنا بھی لو تو تمہارے اندر وہ حوصلے ہیں۔؟

میں اسی وقت یہاں سے جا سکتا ہوں، جب کہ مجھے آزادی مل جائے ورنہ

میں ایک غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ وطن سے دور غیر ملک میں ہی مرنا پسند کروں گا جب تک کہ یہ ملک آزاد ہے اور اگر تم مجھے آزادی نہ دے سکے تو تمہیں مجھے قبر دینی ہوگی۔"

یہ ان کی تڑپتی ہوئی تقریروں کے چند جملے تھے جو ترجمہ کر کے پیش کر دئے گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہی ان کی بے لوث خدمات اور باغیانہ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے، شاید اتنی جرأت آج تک ہندوستان یا پاکستان کے کسی بھی لیڈر میں نہ آسکی جو لندن میں جاکر تاج برطانیہ کے سامنے آزادی کی خاطر للکارے۔

سید سلیمان ندوی کا خراج تحسین | مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے قلم سے ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کیا وہ بھی لکھے جانے کے لائق ہے۔

"افسوس پرورد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی۔ وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا زمین کا قیامت تک کیلئے ساکن ہوگیا۔ وہ اشکبار آلود آنکھیں جو دین وملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، جس زمانہ ان کی روانی ہمیشہ کے لئے بند ہوگئی۔

تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو۔ تو ملت اسلامیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے۔ تو دنیائے اسلام کا ماتم کناں تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے۔ ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کیلئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خوان، حجاز کا سوختہ غم اور بیت المقدس کے لئے وقف الم ——— اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلامیہ کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لئے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جاتے اور تو اس میں سما جاتے۔"

محمد علی جوہر سے مولانا مرحوم کی ملاقات سب سے پہلے ۱۹۱۳ء میں الہلال کے دفتر کلکتہ میں ہوئی۔ اس وقت کامریڈ کو نکلے گرچہ صرف دو سال ہوئے تھے، لیکن اس دو سال میں کامریڈ کی آواز کلکتہ اور دہلی سے نکل کر شکم پہیں میں ٹکرا رہی تھی، اور دنیا کا چپہ چپہ مولانا محمد علی کی پکار سن چکا تھا۔

آج لیڈروں نے ان سے عمل کا طریقہ سیکھا۔ مولانا محمد علی دہلی میں کوچہ چیلاں میں مقیم تھے۔ ان کی رہائش گاہ اس وقت سیاسیات کا مرکز تھا جہاں گاندھی جی سے لیکر ہندوستان کا ہر چھوٹا اور بڑا لیڈر آتا اور ان کی قیامگاہ کے صحن میں بیٹھ کر سیاست کی چال سمجھتا، سیاست کی زبان سیکھتا اور جرأت رندانہ کا سبق حاصل کرتا۔ محفل بارونق ہوا کرتی اور درجنوں حضرات مولانا مرحوم سے بات چیت کرتے رہتے یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے کوئی بھی مصنف اگر وسعت قلب و نظر رکھنے کے سبب فراموش تو کرسکتا ہے۔ لیکن جھٹلا نہیں سکتا۔

دیوان سنگھ مفتون کا خراج تحسین مولانا محمد علی کانگریس کے صدر بھی رہے۔ بقول پنڈت نہرو "انہوں نے کانگریس کو نئی روح اور ہمت بخشی، لیکن پھر بھی کانگریس سے علیحدہ محاذ بنانے کی ضرورت کیوں محسوس کی، یہ ایک علیحدہ موضوع بحث ہے جس کی طوالت میں پڑنا میرا یہاں پر کام نہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے ہندو معتقدین میں سے ایک شخص جناب دیوان سنگھ مفتون نے اپنی تحریر میں یہ اعتراف کیا ہے کہ "مولانا نے کانگریس سے علیحدگی کانگریس کے لیڈروں کی حماقتوں کی وجہ سے اختیار کی۔ مردم ناشناسی اور بے قدری کے باعث کانگریس مولانا جیسی بے ریا۔ لائق اور بلند شخصیت سے محروم ہوگئی۔ اور یقیناً یہ ہندوستان کی بدنصیبی تھی کہ لارڈ اردن سے ملنے کے لئے جب پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل وغیرہ کا ڈیپوٹیشن تیار ہوا تو ان لیڈروں نے مولانا کو پوچھا تک نہیں تھا"

دیوان سنگھ مفتون نے جو جائزہ لیا وہ ان کا اپنا نظریہ ہے ورنہ دراصل بات یہ تھی کہ ۱۹۱۱ء میں جب بنگال کی سابق تقسیم کو ختم کرکے متحدہ بنگال کر دیا گیا، اسی وقت مولانا کو برطانیہ اور ہندوؤں کے ساتھ اعتماد نہ رہا۔ اور جوں جوں وقت گذرتا گیا اور آزادی کی تحریک کے اثرات جڑ پکڑنے لگے، مولانا مرحوم کو روز روشن کی طرح عیاں ہوتا گیا کہ کانگریس کا نیشنلسٹ نعرہ ایک سیاسی فریب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ بلکہ کانگریس ہندوؤں کی جماعت ہے، جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی فلاح نہیں، لہذا انہوں نے اپنا لائحہ عمل اسی وقت بدل دیا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے کانگریس ہی کو مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ پارٹی سمجھ کر اس میں شریک رہے۔

مولانا محمد علی مرحوم کی ذات کیساتھ چنانچہ کتابوں میں جو بددیانتی برتی گئی وہ اس سیاسی اختلاف کے باعث ہوئی اور دوسری وجہ ان کی جانب سے قصداً اور عمداً بے توجہی سے پیش آنے کی یہ کہی جاسکتی ہے کہ چونکہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ اگر ان کا تذکرہ دیانتداری سے کیا جاتا تو دوسرے رہبران راہ آزادی کا کوئی شمار نہیں ہوتا۔ ■■

معاشی کامیابی کا راز

والدین اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کا اثر یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ ایسے شخص کی زندگی بڑھا دیتا ہے۔ تقدیر مبرم خدا کے ہاتھ میں ہے ہر نظام ظاہری و باطنی اسباب سے وابستہ ہے مگر تقدیر معلق کی وجہ سے (جو بدل سکتی ہے) اسکی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ تو تم میں سے کون نہیں چاہتا کہ زندگی میں برکت ہو۔ اولاً عزیز و اقارب کا حق ہے، پھر پڑوسی اور اہل محلہ کا کہ ان سے بھلائی کرو پھر گاؤں کا اور سارے علاقے کا، اگر سب ان حقوق کی پاسداری کرنے لگیں تو پھر دیکھیں کہ خدا اپنے رزق کے خزانے تم پر کھولتا ہے یا نہیں اگر تم ہر ایک کو کچھ دے نہ سکو تو کم از کم ہر مسلمان کے خیر خواہ ضرور ہو خوش خلقی بھی بڑی چیز ہے۔ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص مرا تو فرشتوں نے پوچھا کہ تو نے کوئی بھلائی بھی کی ہے یا نہیں۔؟ سوچ کر کہنے لگا کہ ہاں میں خدام، نوکروں اور ماتحتوں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرتا رہا، اگر ایک شخص دے سکنے کے باوجود مجھے اپنا قرض نہ دیتا اور مہلت مانگتا تو اسے مہلت دے دیتا کہ چلو جب ہو جائیگا تو دیدے گا۔ دکان میں لوگوں سے حسن خلق اور نرمی کا برتاؤ کرتا رہا، صرف یہی بھلائی میں نے کی ہے، خدائے پاک نے اُسے بخش دیا کہ میرے بندے نے لوگوں کے ساتھ عفو اور درگذر کا برتاؤ کیا ہے، تو میں بھی اس سے عفو کرتا ہوں مقولہ ہے کہ " تاجر نرم حاکم گرم " تو کامیابی اس طریقے سے ہوگی حاکم اگر مجرموں کے حق میں گرم ہو تو وہ ڈرتے رہیں گے اور تمام خراب لوگ سہمے رہیں گے اور تجارت میں نرمی اور خوش خلق برتو گے تو کامیابی ہوگی، حضورِ اقدس نے فرمایا کہ خدا میرے اسی امتی پر رحم کرے جو خرید و فروخت (بیع و شراء) کے وقت نرمی اور خوش اخلاق کا مظاہرہ کرے اور ہنسی خوشی سے معاملہ کرے چاہے گاہک سختی سے کیوں نہ پیش آئے۔ اسی طرح اُس شخص پر جو قرض مانگنے میں بھی نرم ہو۔ رحم اللہ امرأ سمحاً اذا اشتریٰ واذا باعَ واذا اقتضیٰ۔ (الحدیث) اس کا فائدہ دنیا میں بھی خدا دے دیتا ہے کہ تجارت بڑھ جاتی ہے اور آخرت میں بھی بخشش اور عفو و کرم کی شکل میں۔

شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ

(اقتباس خطبہ جمعہ ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء)

مولانا عبدالرزاق سنگین

علمائے حق کا اوڑھنا بچھونا

اعلائے کلمۃ الحق

امت مسلمہ کی ترقی و نشو و نما میں اعلائے کلمۃ الحق کی آبیاری کو حد درجہ دخل ہے، جب تک یہ روح ہمارے دل و دماغ میں جاری وساری رہی، ہم آگے بڑھتے رہے، اور جب یہ سپرٹ فنا ہوگئی، ادبار کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی گئی ـــــــ

"افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر"

جب انسان اس حدیث پر سوچنے لگتا ہے، تو ذہن میں چند سوالات ابھرنے لگتے ہیں، اور انہی سوالات پر غور و فکر کرنے سے ہی اعلائے کلمۃ الحق کی اہمیت خود بخود واضح ہو جاتی ہے، سب سے پہلا سوال جو ذہن انسانی سے ٹکراتا ہے، وہ یہ ہے کہ کیوں جابر سلاطین کے آگے اعلائے کلمۃ الحق افضل الجہاد ہے۔؟ پھر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ تمام عبادتوں اور فریضوں میں سب سے زیادہ کٹھن فریضہ جہاد ہی ہو سکتا ہے، باقی عبادات اور فرائض اسی کے گرد منڈلاتے ہیں، اور اسی کا اثر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر لامحالہ پڑتا ہے، نماز روزہ وغیرہ انفرادی عبادتیں ہیں، اسی طرح ان کے اثرات بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان کے نتائج کا اثر بھی انسان یا مسلمان کی انفرادی زندگی پر پڑتا ہے، اور پھر فی زمانہ نماز اور روزہ وغیرہ دوسری عبادات میں اتنی قربانی دینے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی، حقیقی جہاد میں، کیونکہ جہاد تو دین کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے ہی کا دوسرا نام ہے، یا یوں سمجھئے کہ آپ نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، قربانی کرتے ہیں، اور ان عبادات سے آپ کو کوئی نہیں روکتا، کوئی حکومت آپ کی مانع نہیں جاتی، کوئی طاقت آپ کی سد راہ نہیں بنتی، لیکن کوئی وقت خدانخواستہ ایسا آن پڑے کہ آپ کو نماز پڑھنے کی

بھاری قیمت ادا کرنی پڑے، قربانی دینے میں کوئی حکومتی قانون مانع آئے۔ زکوٰۃ دینے اور حج کرنے پر کوئی پابندی عائد کردی جائے، غرض اسلام کے جملہ ارکان یا کسی ایک رکن پر عمل پیرا ہونے میں کوئی طاقت سدّ راہ بنے تو اس وقت آپ کو مسلمان رہنے کیلئے کیا تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی، ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی آپ کیا سبیل نکالیں گے۔؟

غرض ان رکاوٹوں کے دور کرنے کی تدابیر سوچنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا دوسرا نام جہاد ہے، جیسے بدن انسانی میں ہر عضو کا اپنا کام ہوتا ہے۔ لیکن وہ عضو تب ہی اپنا کام بخوبی کرسکتا ہے، جب اس میں خون گردش کرے، بعینہ اسلام کے دیگر ارکان و فرائض اعضا کی مانند ہیں، اور جہاد ایسا ہی ہے، جیسا انسانی رگوں میں خون دوڑتا ہے، جس قوم میں روح جہاد باقی نہ رہی تو سمجھنا چاہئیے، کہ اس کے اعضاء میں دوران خون نہ رہا، وہ زندہ تو رہے گا، لیکن اس کی زندگی ایک مفلوج شخص کی زندگی ہی ہوگی، ویسے تو اپاہج بھی زندگی کے روز و شب گذارتا ہے، لیکن ایسی زندگی سے موت بہتر ہے، کیونکہ زندگی فقط سانس لینے کا نام نہیں۔ جہاد کیا ہے ایک انقلابی قوت ہے، ایک محور ہے جس کے گرد تمام عبادات اور فرائض گردش کرتے ہیں۔ لہذا سے

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

اس ضمن میں دوسرے سوالات جو انسانی ذہن میں ابھرتے ہیں، وہ یہ ہیں، کہ اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ کس طبقہ نے زیادہ ادا کیا، اور اس کے نتائج کیا رہے۔؟

۱۔ ان سوالات کو لیجئے، سب سے پہلا سوال کہ جابر سلاطین کے آگے کلمۃ الحق کیوں افضل الجہاد ہے۔؟ کیا صفحۂ ہستی پر سلاطین کے علاوہ کیا دوسرے طبقات انسانی نہیں رہتے۔؟ اس دنیا میں جس میں آپ اور ہم زندگی کا سانس لیتے ہیں، مختلف گروہوں کا وجود ہے، اہل تجارت بھی ہیں، اہل زراعت بھی، شاعر بھی ہیں اور صنعتکار بھی۔ دکاندار بھی ہیں اور گاہک بھی، اور مختلف پیشوں کے لحاظ سے دیکھا جائے، تو یہ دنیا بھان متی کے کنبے سے کم نہیں۔ اور پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ یہ ان تمام طبقوں سے بھی دین کے معاملے میں فروگذاشتیں ہوتی ہیں، کوتاہیاں معرض وجود میں آتی ہیں۔ مختلف غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، لیکن ان کو ان غلطیوں، کوتاہیوں اور فروگذاشتوں سے روکنے اور ٹوکنے کو تو جہاد نہیں کہا جاتا ہے، بلکہ تبلیغ کا نام دیا جاتا ہے، امر بالمعروف کہا جاتا ہے۔ نہی عن المنکر سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ارباب اقتدار کے سامنے حق گوئی نہ صرف جہاد بلکہ افضل الجہاد بن جاتی ہے۔

اگر آپ گذشتہ سطور سے کسی نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں، تو آپ جھٹ پکار اٹھیں گے کہ

دوسرے لوگوں کو روکنے سے کسی پر کوئی آفت نہیں ٹوٹتی ستم کے پہاڑ نہیں ڈھائے جاتے، اور بیباکی کے جرم کی پاداش میں زبان نہیں کاٹی جاتی، اور پابند زنجیر و سلاسل نہیں ہونا پڑتا، اور بات کسی حد تک سچ بھی ہے، واقعی بادشاہوں اور جابر بادشاہوں کو کڑوی بات کہنا مصائب و آلام کو دعوت دینے کے مترادف ہے، لیکن معاملہ صرف یہیں نہیں ٹھہرتا بلکہ اس کی زد آگے آگے ٹوٹتی ہے، بادشاہوں کے علاوہ دوسرے طبقاتِ انسانی کے جرائم چونکہ انفرادی ہوتے ہیں، لہذا ان کا اثر بھی انفرادی رہتا ہے۔ لیکن بادشاہ میں ایک خرابی پیدا ہو کر صرف اسکی ذات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ بادشاہ سے آگے بڑھ کر دربار اور دربار سے بازار دل تک پہنچ جاتی ہے، اس کا ایک سیب کھانا ہی باغات کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینے کیلئے کافی ہے۔ اور پھر یہ خرابی سبب ایک دفعہ پیدا ہو جائے تو نہ صرف اس عہد تک رہتی ہے، بلکہ صدیوں تک، اس کا عمل دخل رہتا ہے، نہ صرف مکان بلکہ زمان تک میں پھیل جاتی ہے، کسے خبر تھی، کہ وہ منحوس بوٹی جو عہد اکبری میں چند پرتگالی "تحفۃً" لائے، اس کے رسیا عوام الناس بن جائیں گے، اور نہ صرف اس وقت کے عوام الناس بلکہ تین چار صدیاں بیت جانے کے بعد آج بھی حقہ کی بدعت کم نہیں ہوئی، بلکہ پھیلتی چلی گئی، اس کا اثر گھٹا نہیں، بلکہ بڑھتا ہی رہا، حتیٰ کہ آج سکول کے بچے تک سگریٹ نوش بن گئے۔

بنیاد ظلم در جہاں اول اندک بود   ہر کہ آمد براں مزید کرد

یہی وجہ ہے کہ مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا تھا کہ اصلاح عوام کیلئے اصلاح سلاطین ضروری ہے، راجہ کا اثر پرجا پر پڑتا ہے، اعضائے رئیسہ کے بگڑنے پر تمام اعضاء کا اس سے متاثر ہو جانا یقینی ہے۔ الناس علی دین ملوکھم۔ صدر مملکت کا اثر پھر صرف پارلیمنٹ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ تمام محکمے بگڑ جاتے ہیں، اگر ملک کا سربراہ خویش پرور ہو تو ہر افسر اقربا نوازی کا شکار ہوگا، اگر ظالم ہو، تو چپڑاسی تک رشوت خور بن جائیں گے، فاسق و فاجر ہو تو فسق و فجور کی آندھیاں چلیں گی، تو چونکہ ان کا بگاڑ اجتماعی بگاڑ ہے، لہذا مفاسد کا سرچشمہ بند کر دینا افضل الجہاد نہ ہو تو اور کیا ہو۔؟

دوسرا سوال کہ افضل الجہاد کا فریضہ کس طبقہ نے ادا کیا۔؟ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ علماء نے، لیکن پہلے سوال کی طرح اس ایک سوال کے ساتھ بھی سوالات کی مختلف کڑیاں مربوط ہیں، کہ کیا دوسرے انسانی طبقات کا وجود نہ تھا، لیکن یہ توفیق علماء ہی کو نصیب ہوئی، اور یہ رتبہ بلند انہی کو فقط کیوں ملا، حالانکہ اور بھی مدعی دار و رسن تھے، اور ہیں۔؟ تو اسکی ایک وجہ تو ظاہر و باہر ہے کہ انما یخشی اللہ

من عبادہ العلماء، لیکن ایک سوال پھر ذہن کا تعاقب کرنے لگتا ہے، کہ دیگر امتوں کے علماء تو خرابیاں لانے میں سلاطین سے پیچھے نہ تھے، بلکہ ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ خدا کا کلام ناطق ہے کہ ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل۔ ان کے فقہا تو بادشاہوں کیلئے ظلم کے جواز کی خاطر فتوے بہم پہنچاتے رہے، یہاں تک کہ حدود و تعزیرات بھی صرف غربا کا نوشتہ مقدر بن چکا تھا، چوری کر کے ہاتھ کٹوانا کھاتے پیتے گھرانوں پر لاگو نہیں ہو سکتا تھا۔ سوسائٹی اور انسان معاشرہ اس حد تک بگڑ چکا تھا، جب اسرائیلی فقیہوں نے ایک زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا، تو حضرت عیسٰی نے فرمایا، کہ بلاشبہ زانی کو سنگسار کیا جائے۔ لیکن وہ شخص حصہ لے جو خود کبھی زنا کا مرتکب نہ ہوا ہو، خود یورپ میں قرون وسطٰی میں پوپوں اور ان کے چیلے چانٹے پادری معافی ناموں کے بہانے کیا گل کھلاتے رہے۔

لیکن اسلامی تاریخ ان بدنما دھبوں سے پاک رہے، اسلامی تاریخ میں یہ نہیں کہ جابر و ظالم بادشاہوں کا وجود نہ تھا، بلکہ ہر دور میں انہی کی اکثریت رہی ہے، لیکن ان کی خرمستیوں کی راہ میں علماء ہی رکاوٹ بنے رہے، امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی کون تھے۔؟ یہ وہی قدسی نفوس اور سعید روحیں تھیں، جنہوں نے جابر بادشاہوں کی خامیوں کی نشان دہی کی اور برسر دربار اعلان حق سے نہ ہچکچائے، شمشیروں کے سایہ تلے حق بات کہتے رہے، اسلامی سلاطین میں بنی امیہ اور عباسیہ کا زمانہ کتنا نازک دور تھا۔؟ لیکن ان میں بھی علمائے حق کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی، اور ایسے فقروں کی گونج اب بھی تاریخ کے طالب علم کے کانوں میں سنائی دے رہی ہے کہ یا ظالم! انا ظالم ان لم اقل لک یا ظالم۔ یعنی جن کو تمام لوگ امیر المومنین کہہ کر پکارتے تھے، انہیں یہ راستباز زبانیں یا ظالم! کہہ کر پکارتی رہیں۔ ایسے الفاظ کتابوں کے اوراق میں اب بھی ملتے ہیں۔ کہ قد ملأت الارض ظلما وجورا۔ کہ روئے زمین ظلم و جور کا گہوارہ بن گئی، اور پھر یہ نہیں کہ یہ جذبات نہاںخانۂ دل میں دبے تھے، یا سلطنت کے کسی دور افتادہ گوشہ میں کسی بند کوٹھڑی میں زبان کی نوک پر لائے گئے، بلکہ ان کی گونج ان درباروں میں سنائی دی، کہ جہاں قیصر روم کے سفیر بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے تابعین اور صحابہ کے آغوش صحبت میں تربیت پائی، اقوال صحابہ اور ارشادات رسول نے اس جذبہ کیلئے صیقل کا کام دیا، چنانچہ یہ راستباز زبانیں کٹ گئیں،

لیکن ان میں لرزی کبھی نہیں لگی ہے

جفا کے ہاتھ سے گردن وفا شعاروں کی کٹی ہے برسر میداں مگر جھکی تو نہیں

انسان حیرت میں ڈوب جاتا ہے، کہ ایک یورپی کلیسا بادشاہوں کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے، بادشاہوں کی خوشنودیٔ مزاج کیلئے انہیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے، یورپ کی تمام تاریخ میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، روشنی کی ایک کرن مارٹن لوتھر ہی دکھائی دیتی ہے، لیکن گلشن اسلامی ہر دور میں ایسے سدا بہار پھولوں سے خالی نہیں رہا جنکی خوشبو سے عامۃ المسلمین مہک اٹھے، یہ راستباز زبانیں کبھی گنگ نہیں ہوئیں، یہ حق و صداقت کے علمبردار فقر و استغناء کے پیکر تھے، قناعت اور خوداری کا مجسمہ تھے، انہیں شاہی درباروں سے نفرت تھی، دولت ان کے آگے آگے نہ تھی بلکہ پیچھے پیچھے تھی، اقتدار ان کی دہلیز پر سر جھکاتا تھا، ایک طرف پادری خوشامد سے یورپی حکمرانوں سے مختلف مطلب برآریوں کی تگ و دو کر رہے تھے تو دوسری طرف یورپی راجواڑوں سے شان و شوکت ہزاروں کی نسبت سے بڑھ کر خلیفہ ہارون الرشید کے حلقۂ درس میں مؤدبانہ بیٹھا ہے، لیکن کیا مجال کہ دیگر خوشہ چینیوں کے مقابلہ میں ان سے ترجیحی سلوک روا رکھا گیا ہو، بلکہ خلیفہ ہارون الرشید باایں ہمہ عظمت و شوکت جو اسے حاصل تھی، آپ سے عرض کر رہا ہے کہ میں اپنی وسیع و عریض سلطنت کے ہر گوشہ میں "مؤطا" کی جلدیں بھیجنا چاہتا ہوں، تاکہ مفتی اسی کے مطابق فتوٰی دیں، حقیقتاً یہ ایک بڑا اعزاز تھا جس سے امام صاحب کو نوازا جا رہا تھا، لیکن امام مالک کے استغنا اور حق پسندی کا یہ عالم تھا، کہ خلیفہ کو یہ کہہ کر روک رہے ہیں کہ یا خلیفۃ المسلمین! لاتفعل هکذا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کو چیف جسٹس کا عہدہ پیش کیا جا رہا ہے، لیکن آپ اس سے برابر انکار فرما رہے ہیں، اور اسکی پاداش میں زندان کی تنگ و تاریک کوٹھڑی قبول کرتے ہیں، اس سلسلہ کی اتنی ان گنت مثالیں ہیں، کہ اگر صرف حجاج بن یوسف، عبد الملک بن مروان، اکبر اعظم اور شہنشاہ جہانگیر کے مستبدانہ دور ہی کے واقعات کو اکٹھا کیا جائے تو اس کے لئے کاغذ کے دفتر در کار ہوں گے، اور ٹنوں کاغذ اور منوں سیاہی سے بھی کام نہ چلے گا ہے

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین نگاہ تو ز داماں گلہ دارد

اس سلسلہ کی آخری کڑی یہ سوال ہے کہ اس کے نتائج کیا رہے ہے، سو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ان کربلاؤں نے اسلام زندہ رکھا، اسلام کی آبیاری کی، آج ہر ملک میں اسلام کے کروڑوں

نام لیوا موجود ہیں، یورپ میں آج مسیحیت دم توڑ رہی ہے، اشتراکی روس سے تو اسے مکمل دیس نکالا مل گیا ہے، لیکن مسلمان ہر اس آہنی کٹہرے میں بھی اسلام اور اس کے نظام پر مکمل اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ابھی تک روس میں ایک مسلمان وزیر کا نام نظر نہیں آرہا، کیونکہ وہاں واحد پارٹی گورنمنٹ ہے، یعنی کمیونسٹ ہی برسر اقتدار آسکتے ہیں، اور وہی شخص انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے جو کمیونسٹ ہو، معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بام اقتدار تک پہنچنے کیلئے کمیونزم کا زینہ استعمال نہیں کرتے، یورپ میں برائے نام عیسائیت کا وجود تو ہے، لیکن نوے فیصد آبادی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے واقعات کو خیالی افسانہ قرار دے رہے ہیں، لیکن مسلمان ہر ملک میں کروڑوں کی تعداد میں پنجوقتہ نمازیں پڑھتے ہیں، رمضان شریف کے روزے رکھتے ہیں، غلامی میں زکوٰۃ انفرادی طور پر ادا کرتے ہیں، حج اور قربانی کی رسوم کی ان کے ہاں مکمل پابندی ہے، پھر عجیب بات یہ ہے کہ جس ملک میں اعلائے کلمۃ اللہ زیادہ کیا گیا، مجاہد علماء کا وجود بکثرت رہا، اس ملک میں اسلام کی جڑیں زیادہ مضبوط رہیں، جیسے برصغیر پاک وہند میں، کہ جہاں علماء کی مکمل جماعت ڈیڑھ سو سالہ غلامی میں اعلائے کلمۃ الحق کرتی رہی، تختہ دار پر لٹکتی رہی، کالے پانی کی صعوبتیں برداشت کرتی رہی، اور کاروان آزادی کیلئے صدائے جرس کا کام دیتی رہی، اس کا نتیجہ یہ رہا کہ بھارت میں بیشمار دینی درسگاہوں کا وجود ہے مسلمانوں کے پرسنل لاء کیلئے کئی صوبوں میں امارت شرعیہ تک قائم ہے، اور پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کیلئے اسلامی نظام کیلئے بھرپور کوششیں ہو رہی ہیں، اگر خدانخواستہ علماء آزادی کیلئے کام نہ کرتے، تو نئی پود یورپ کی طرح مذہب سے متنفر ہو جاتی۔

اس مرحلہ پر ایک اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں تو علمائے سوء کا وجود بھی رہا ہے، جو بادشاہوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے، ان کے مذموم ارادوں کیلئے فتویٰ دیتے رہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے، کہ ان علماء نے نہ تو عوام الناس کو متاثر کیا، نہ ان کی گود میں علمی نسل پروان چڑھی، وہ صرف درباروں کو زینت بخشتے رہے، لیکن علمائے حق مسند تدریس پر جلوہ افروز رہے، ان کے آگے آنے والے دور کے علماء زانوئے شاگردی تہ کرتے، اور ان کے کردار سے سبق حاصل کرتے رہے، انہی کے فیض صحبت نے ان میں حق گوئی و بیباکی کی روح پھونکی، پھر جس مدرسہ اور مکتب میں مجاہد علماء تھے، اس مدرسہ کے فضلا کی زیادہ تعداد اعلائے کلمۃ الحق پر عمل پیرا رہی، جیسے دارالعلوم دیوبند، آج آپ کو جتنے علماء سیاسی میدانوں

میں ملیں گے، وہی ہوں گے، جنہوں نے اسی مادرِ علمی کی گود میں پرورش پائی ؎

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیم صبح تیری مہربانی

باقی رہے علماءِ سو تو ان کی مثال درخت کی ان شاخوں کی سی رہی جو خشک ہوگئیں، نہ ان میں کونپلیں پھوٹیں، نہ پھول لگے، نہ پتے، اور نہ انہوں نے پھل دیا، علمی نسل پھیلی تو ان بوریا نشینوں سے، جو مصائب سہتے رہے، لیکن حق بات کہتے رہے، جو درباروں سے وابستہ رہے، انہیں درس و تدریس سے پھر کوئی واسطہ ہی نہ رہا، بلاشبہ علمائے حق نے حق کی خاطر اپنی جانیں دیں لیکن اپنے کردار سے شاگردوں اور عوام الناس پر ایک لافانی اور دیرپا اثر بھی چھوڑا، اور علمائے سوء اپنی موت آپ ایسے مرے، کہ یہاں تک کہ ان کے نقوشِ عظمت و سطوت پر آج کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ رہا۔ یہ شعر دونوں طبقوں کے کس قدر حسب حال ہے ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

بقیہ: حج

اپنے خاص تعلق کا اثبات کرتا ہے، اور آپ یہاں بھٹکتے ہیں۔ کلا واللہ کلا واللہ اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل قول صادق امین ہے قیمۃ المرء ہمتہ۔

بقدر الجد تکتسب المعالی ومن رام العلیٰ سھر اللیالی

بہ انداز محنت بلند درجات حاصل ہوسکتے ہیں، جو شخص بلند درجہ کا قصد کرتا ہے وہ برابر رات کو جاگتا ہے۔

سوائے رضاء محبوب حقیقی اور کوئی دھن نہ ہونی چاہیئے ؎

دنیا و آخرت را بگذار و حق طلب کن کایں ہر دو لولیاں را من خوب می شناسم

"بجوش و بجوش و بیچ مفروش"

تصحیح احادیث کا معیار

تمہید | اس زمانہ میں کہ ہر طرف سے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناقابلِ اعتبار قرار دینے کی مہم منکرین حدیث کی جانب سے پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ ہم معیار تصحیح حدیث کو بیان کرنے سے قبل تمہید کے طور پر ایک سوال کا جواب دینا اور ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں ہم کو حدیث کی موجودہ تقسیم — صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ — کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یہ تقسیم کہاں سے اور کیونکر آئی۔؟ آخر تیسری صدی کے محدثین کے سامنے حدیث کے بارے میں صحیح، ضعیف اور حسن وغیرہ کا سوال کیونکر پیدا ہوا۔ اور جب کہ سب ہی حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہیں تو پھر ان میں صحت و عدم صحت اور قوۃ و ضعف کا فرق مراتب کس راہ سے آیا۔؟ یہی سوال ہے جسکی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں کو تو یہ بھی کہتے سنا گیا ہے کہ ضعیف حدیث ہے ہی نہیں۔ بلکہ حدیث تو صرف صحیح یا حسن ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدماء محدثین کے ہاں تو ہمیں صحیح اور ضعیف صرف دو قسمیں ہی ملتی ہیں۔ یہ تیسری قسم۔ حسن۔ متاخرین نے کہاں سے اختراع کر لی۔؟

احادیث کی تقسیم کا منشاء | اس سوال کا اجمالی سا جواب تو یہ ہے کہ احادیث کی یہ تقسیم راویانِ حدیث کے ضبط و اتقان کے مختلف درجات کے اعتبار سے ہے نہ کہ نفسِ حدیث کے اعتبار سے اس لئے کہ نفسِ حدیث کے اعتبار سے تو حدیث کی صرف ایک ہی قسم صحیح ہے ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں لوگوں کے درمیان قوتِ حافظہ و یادداشت کے اعتبار سے

فرق ہوتا ہے۔ کسی کا حافظہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ بلا ارادہ کان میں پڑی ہوئی بات پتھر کی لکیر کیطرح محفوظ رہتی ہے، اور بعض کا حافظہ اتنا کمزور ہوتا ہے کہ بغور سنی ہوئی اور بالقصد یاد کی ہوئی بات بھی ذراسی دیر میں بھول جاتے ہیں، یہی قوت حافظہ کا فرق مراتب حدیث کی تقسیم کا سبب ہے نہ کہ نفس حدیث۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ بالکل درست ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل اور ہر تقریر حدیث ہے۔ اور فی نفسہ اس میں کسی قسم کی تقسیم نہیں ہے، اس لئے کہ خدا کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) معصوم ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول و فعل خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہی حفاظت میں پروان چڑھتا اور طے پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس صحابی نے جو بات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی اور جو کام خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا یا جس تقریر[1] رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خود مشاہدہ کیا وہ اس صحابی کے حق میں قطعیت کا حکم رکھتا ہے، لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ——— جو سعادت ابدی کا سرمایہ اور حیات دائمی کی ضمانت ہے ——— آپ کی احادیث کی معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی بالکل اسی طرح حدیث کے بغیر نہ تو قرآن کو سمجھنا ممکن ہے، اور نہ اس پر عمل کرنا۔ اس لئے قرآن کی حفاظت کی طرح حدیث کی حفاظت اور اسکو آنے والی نسلوں تک پہنچانا امت کا ایک اہم فریضہ ہے جسکو تقریباً چودہ سو۱۴۰۰ سال سے آج تک امت ادا کرتی چلی آرہی ہے۔ اور قیامت تک اس فرض کو ادا کرکے وعدۂ خداوندی انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون کو عملی جامہ پہناتی رہے گی۔ اسی فریضہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبہ ——— حجۃ الوداع ——— میں ارشاد فرمایا کہ:

لیبلغ الشاھد الغائب۔ (بخاری ص۱۶/۱)	کہ موجودہ نسل میرا یہ پیغام آنے والی نسل تک برابر پہنچاتی رہے۔

اب یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ پیغام رسانوں میں حفظ و ضبط اور تقویٰ و صلاح وغیرہ میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ بلکہ زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جیسے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور کے آخر میں فرمایا کہ:

فان الشاھد عسیٰ ان یبلغ	ممکن ہے شاید کسی ایسے غائب کو میرا یہ پیغام

---

[1] تقریر اصطلاحی لفظ ہے۔ یعنی جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کیا گیا ہو اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔ ۱۲

من ھو اوعیٰ لہٗ منہ ۔ (بخاری ج۱) پہنچائے جو اس سے زیادہ اسکو یاد رکھنے والا ہو۔

تو راویوں کے اس قدرتی تفاوت اور فرق کا اثر انکی مرویات پر لازماً پڑیگا۔ اور اس کے نتیجہ میں حدیث کے بھی مراتب اور درجات ضرور قائم ہوں گے۔

سہو و نسیان کا علاج حضورؐ نے بتلا دیا ہے۔ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے دور میں سہو و نسیان اور خطاء کا احتمال اور وجود تو پایا جاتا ہے اور اس کا تدارک بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے، جیساکہ مسند احمد کی ایک روایت ہے :-

عن عمرو بن العاص رضؓ قال قلت یارسول اللہ انا نسمع منک احادیث لا نحفظھا افلا نکتبھا؟ قال بلی فاکتبوھا۔ (مسند احمد)

حضرت عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا ہم آپ سے بہت سی حدیثیں سنتے ہیں (چونکہ ہم ان کو لکھتے نہیں اس لئے) ان کو یاد نہیں رکھ پاتے، تو کیا (انکو محفوظ کرنے کیلئے) ہم لکھ نہ لیا کریں۔؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں لکھ لیا کرو۔

اسی طرح بخاری ص۲۲ ج۱ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث ملتی ہے کہ :-

قلت یارسول اللہ انی اسمع منک حدیثا کثیرا انساہ ۔ قال ابسط رداءک فبسطتہ ۔ الخ (بخاری ص۲۲ ج۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے سوء حفظ کی شکایت کی تو آپ نے (اس کا علاج کرنے کے لئے) فرمایا اپنی چادر بچھاؤ۔ میں نے اسکو بچھا دی۔ آپ نے اس میں کوئی معنوی چیز ڈال دی۔ اور فرمایا اپنے سینے سے چمٹاؤ۔ بس پھر میں کبھی کوئی بات نہیں بھولا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی ایک دوسری روایت ترمذی میں بھی آتی ہے کہ :

کان رجل من الانصار یجلس الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث فیعجبہ ولا یحفظ ..... فشکا ذلک الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انی لاسمع منک الحدیث

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ انصار میں سے ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتا اور حدیثیں سنتا تھا۔ اور حدیثیں اسکو اچھی بھی بہت لگتی تھیں، لیکن وہ انکو یاد نہیں رکھ پاتا تھا۔ تو اس نے اسکی شکایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی کہ میں حدیثیں سنتا ہوں

فیعجبنی ولا احفظہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بیمینک واومأ بیدہ للخط۔ (ترمذی باب ماجاء فی الرخصۃ فی الکتابۃ) صہ ۲ ج ۲

اور مجھے اچھی بھی لگتی ہیں لیکن یاد نہیں رکھ پاتا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے داہنے ہاتھ سے امداد حاصل کرو اور اس سے مقصد آپ کا کتابت کیطرف اشارہ کرنا تھا کہ لکھ لیا کرو۔

ان احادیث سے یہ بات روز روشن کیطرح واضح ہوگئی کہ صحابہ وتابعین کے دور میں سہو ونسیان اور خطاء کا احتمال تو تھا۔ اور اس کا علاج بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا۔ اور اسی احتمال کی وجہ سے پیش بندی کے طور پر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو ہر ممکن طریقہ سے محفوظ رکھنے کی ترغیب دلائی چنانچہ جامع ترمذی میں ارشاد مروی ہے:

نضر اللہ امرأ سمع منا شیئاً فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی من سامع۔ (رواہ البخاری ایضاً)

خدا اس شخص کو تر وتازہ اور خوش وخرم رکھے جس نے ہم سے جو سنا اسے بعینہٖ جیسا سنا تھا (دوسرے کو) پہنچا دیا۔ اس لئے کہ بہت سے وہ لوگ جنکو بات پہنچائی جاتی ہے (ہم سے) سننے والے (راوی) کی نسبت اس (بات) کو زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ (استاد بھول جاتا ہے شاگرد نہیں بھولتا)

بس ! یہی سہو ونسیان اور خطاء کا احتمال تھا صحابہ کرام وتابعین کے زمانہ میں۔ اس کا بھی آپؐ نے علاج فرما دیا۔ پیش بندی کے طور پر احادیث کو ہر ممکن طریقہ سے محفوظ کرنے کی ترغیب دلائی۔

صحابہؓ سب سے سب عادل ہیں | لیکن اس زمانہ میں کذب (عمداً جھوٹ) ؟ تو اس کا صحابہ کرامؓ میں نام ونشان تک نہ تھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے بارے میں ببانگ دہل شہادت دی کہ:

اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اھتدیتم۔ (طبرانی۔ بیہقی وغیرہما)

میرے اصحاب (اور مسجد نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ) آسمان ہدایت کے ستارے ہیں۔ ان میں سے جس کا بھی دامن پکڑو گے منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے۔

اسی وجہ سے جمہور امت کا اتفاق ہے کہ "الصحابۃ کلہم عدول" (صحابہؓ سب کے سب عادل ہیں)

(باقی آئندہ)
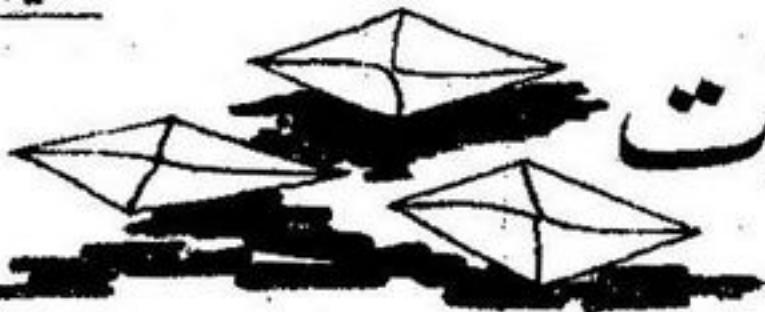
سرمایہ داری اور کمیونزم کا پس منظر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عظیم رومن ایمپائر میں یہودی قوم صرف اقلیت تھی۔ رومن ایمپائر کے پاس اپنے بنائے ہوئے مشہور اور سنہری اصول نظریات اور قوانین وضوابط تھے۔ لیکن بدقسمت اور کج فہم یہودی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے بیشمار اور ان گنت انعامات کی ناشکری کی، بے جان، بے روح اور کھوکھلے مظاہر سے متاثر ہو کر وحشیانہ اور سنگدلانہ زندگی بسر کرنے لگے، تو حسب قانون اللہ تعالیٰ نے معاشرتی سیاسی اور اقتصادی نظام سے قطع نظر کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو محض نرمی و رواداری، تزکیۂ نفس، تطہیر قلب وضمیر، صبر وتحمل، رحم وکرم، عفت وپاکبازی، زہد و صفا اور فکر آخرت کا داعی بنا کر بھیجا۔ مسیحیت نے روحانیت میں وہ درجہ کمال حاصل کیا۔ کہ لوگوں کے قلب وضمیر میں دنیوی ضروریات کو فکر آخرت نے زیر کر لیا۔ منشاء الٰہی کے تحت مسیحیت روحانی متاع کو لیکر یورپ پہنچی۔ یورپ کے اطراف وجوانب میں اسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں منقسم قبائل سے واسطہ پڑا، جو بڑے تلخ اور سخت مزاج تھے۔ خونریزی اور جنگ وجدل کے دھنی تھے، سنگدلانہ اور وحشیانہ سلوک ان کی طبیعت میں سرایت کر چکا تھا۔ امن وچین کے نام تک سے گھبراتے تھے۔ ان کے علاوہ یونان کی مادی تہذیب کی وارث اور صنم پرست قوم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے ناممکن تھا کہ وہ مسیحیت کی اس نرمی اور رواداری کی طرف مائل ہوتے جو یہ سکھاتی ہو کہ "جو تیرے ایک رخسار پہ طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کے آگے کر دے، اور جو تجھ سے جھگڑا کر کے تیرا کرتا اتار لینا چاہے، تو اپنی چادر بھی اسے دیدے۔"

جب وحشی اقوام پر یہ ظاہر ہوا کہ مسیحیت قوانین حکومت اور سماجی نظام سے تہی ہے تو انہوں نے اس میں کوئی زحمت محسوس نہ کی کہ چرچ اور ہیکل مقدس میں چند سانس مذہب

کے تحت گزار لیں، بعد میں نفسانی خواہشات اور وحشیانہ اصول و قوانین کے تحت زندگی گزار دیں۔ یورپ والوں نے جب یہ دیکھا کہ مسیحیت صرف چرچ، ہیکل مقدس اور قلب و ضمیر ہی میں محدود ہے تو کہا کہ "مذہب بندے اور خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ امور مملکت، معاشی معاملات، انسانی تعلقات، اجتماعی روابط اور زندگی کے مسائل میں اسکا کوئی دخل نہیں"۔۔۔۔ بس یہیں سے یورپ میں دین و دنیا کی تفریق نے جنم لیا۔ اسی لئے یورپ آج تک وحشیانہ اور امن چاہی زندگی پر گامزن ہے، جو امن و سکون سے تہی، خود غرضی اور ظلم و تشدد ان کا زیور ہے۔ اب مذہبی زعما کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ اپنی روحانی متاع کے ذریعے امراء و سلاطین اور تونگر و متمول اشخاص کے مقابلے میں جائیدادیں اور فوج وجود میں لائی جائیں، تاکہ عوام الناس پر ہمارا غلبہ اور اثر و رسوخ رہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا مذہبی زعما اور امراء و سلاطین کے درمیان کشمکش طول اختیار کرتی گئی۔ القصہ دونوں گروہ عوام الناس کو مسخر رکھنے اور مادی مفاد کے لئے دامنِ صلیب میں پناہ گزیں ہوئے، ایک وقت آیا کہ ان کی عیاری اور مکاری واضح ہو گئی، ان کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کہا گیا کہ "مذہب اقتدار کو برقرار رکھنے کیلئے آلۂ کار ہے۔" حقیقت بھی یہی تھی۔ ذرا کسی نے سر اٹھایا فوراً قتل یا نذرِ آتش کر دیا جاتا۔

بیداری نے جنم لیا، جس کا نتیجہ سائنس تھی۔ سائنس کے جدید نظریات و خیالات کی تاب نہ لا کر چرچ نے مخالفت شروع کی۔ کیونکہ یہ نظریات اس کے لئے سم قاتل تھے چھوٹا اقتدار اور اثر و رسوخ ہاتھوں سے جاتا تھا۔ بس یہیں سے مذہب اور سائنس میں نزاع کی داغ بیل پڑی۔

سائنس نے ترقی کی، نئے آلات سے وسیع پیمانے پر ضروریاتِ زندگی پیدا کی گئیں، سائنس کے ذریعے بڑے بڑے کارخانے بنائے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انکے چلانے کیلئے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس طرح سرمایہ داروں اور مزدوروں کے دو گروپ وجود میں آئے، حکومت کی باگ ڈور بھی عملاً ان ہی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آئی۔ مزدوروں کو حیوانوں کی مانند استعمال کیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ چرچ نے اپنے مفاد اور اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے سرمایہ داروں سے رابطہ قائم کیا، اور مزدوروں کو مذہب ہی کے ذریعے انکا دستِ نگر کئے رکھا۔ لیکن بعض اسوقت بھی خالص اللہ کے لئے دین کا کام کرتے رہے۔

مسیحیت کے سچے زعمار نے سرکار نواز رہنماؤں کی مخالفت شروع کی جس سے مزدور طبقہ جاگ اٹھا اور مذہب سے بالکل ہی متنفر ہو گیا۔ مذہب کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا علم بلند کیا۔ ان کی صدا یہ تھی کہ " مذہب افیون ہے جو سرمایہ داروں کیلئے آلۂ کار ہے۔ اس طرح کمیونزم کی بنیاد پڑی، یہ سب کچھ یورپ میں ہوا، دنیا کے تمام ممالک دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم کی نذر ہو گئے۔ عصر حاضر کے بعض علما بھی مسیحیت کے علمبرداروں کی طرح مادی مفاد اور شہرت کی خاطر دائیں بازو اور بائیں بازو سے ملے ہوئے ہیں، جو اسلام کا نام لیکر سرمایہ داری اور کمیونزم کا پرچار کر رہے ہیں۔ پاکستان میں دائیں بازو کی حامی جماعت اسلامی صف اول میں ہے۔ اور بائیں بازو کی حامی نیشنل پارٹی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی مخالفت میں سرگرم ہیں اور علمائے حق شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنیؒ سے لیکر آج تک ان دونوں کی مخالفت اور اسلام کے پرچار میں اپنی زندگیاں وقف کر بیٹھے، کیونکہ انہیں خداوند قدوس سے امداد ملتی ہے ــــ

(شمس القمر بلٹی)

▲

اس وقت جنوری کا شمارہ سامنے ہے، نقش آغاز سب سے پہلے پڑھا کرتا ہوں، پہلے بھی بارہا ارادہ کیا کہ پیغام تہنیت ارسال کروں، مگر اب کی بار جو تمام نہاد محقق کے تعاقب میں چند سطریں مختصر مگر نہایت جامع، پڑھیں تو دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئیں، اور چند الفاظ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

واقعی ان لوگوں کو اگر خدمت اسلام ہی مقصود تھی تو بجائے اس کے کہ جتنی تحقیق (نہیں تو بلکہ تنقیص) انہوں نے صحابہؓ کے بارے میں تاریخ کو سامنے رکھ کر کی، صحابہؓ کی غلطیاں نکال کر ایک ایک کر کے عوام کے سامنے رکھ دیں، اور عامۃ الناس کو اسلامی سپوتوں سے بے اعتماد کرنے کی ناکام کوشش کی، اتنی کوشش اگر تدبر فی القرآن پر صرف کرتے، تفاسیر و احادیث اور اسلاف کا مطالعہ کر کے صحابہؓ پر کئے جانے والے مخالف اسلام لوگوں کے خود تراشیدہ اعتراضات کا جواب دیتے تو حقیقتاً یہ تعمیری پہلو ان کی عاقبت ہی نہیں دنیا میں بھی نیک نامی کا باعث بنتا۔ لیکن یہ مار آستین بن کر اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں مصروف ہیں، تاکہ قصر اسلامی خود بخود منہدم ہو جائے

(قاری محمد سلیمان کیمبل پور)

الحق ماہ جنوری کے اداریہ کو دیکھتے ہی ارادہ کر رہا تھا کہ تبریکی خط پیش خدمت کروں کیونکہ شاید پہلی دفعہ اس صراحت کے ساتھ دشمنانِ صحابہؓ کی خبر لی گئی ہے جسکی ضرورت بہت پہلے تھی، اللہ تعالیٰ آپکی قلم کو اور برکت عطا فرمائے۔ میں نے حکیم ظفر سیالکوٹی کو کتاب معاویہؓ لکھنے کیلئے کہا تھا کہ میرے نزدیک تمہاری نجات کے لئے یہی کافی ہے، اور یہی بات آج میں اپنے بھائی کو پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں۔

(ظہور الحق، لاہور)

الحق شمارہ ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ میں مولانا محمد جعفر صاحب پھلواری کے محولہ مضمون پر جناب مولانا محمد یوسف صاحب (ماموں کانجن) کا مضمون (رویت ہلال کی شرعی حیثیت) پڑھ کر ایک طرف مولانا محمد یوسف صاحب کی جانب سے رویت کے حقیقی، مجازی، قلبی بصری، حلمی تفصیلات اور نقل کردہ احادیث کی شائع شدہ قسط، دوسری طرف مولانا محمد جعفر صاحب کی تحقیق و تفتیش کا حاصل کہ رویت کا معنی یہاں علم ہی سے لینا ضروری ہے۔ یہ تمام باتیں نظر سے گذریں۔

اس بارہ میں دخل دینے اور مزید کچھ لکھنے کی تو شاید ضرورت نہ ہو کیونکہ رویت ہلال کی متعلقہ احادیث کا اصل مقصد مولانا محمد یوسف صاحب نے واضح کر دیا ہے، جو نہایت ہی صاف اور پوری امت مسلمہ کا تسلیم کردہ فیصلہ ہے، اور اگر مولانا محمد جعفر صاحب کا یہی مقصد ہے جس کو مولانا محمد یوسف صاحب اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ (میری نظر سے ثقافت کا وہ شمارہ نہیں گذرا ہے) تو یہ صرف بے جا جسارت نہیں بلکہ نہایت پست اور خام و ناکام تحقیق و تجسس ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسکی باقاعدہ تنظیمی کاروائی اپنی متوازن رفتار سے جاری ہے اور اہل حق کا طائفہ ہمیشہ اس کے خلاف مصروف جہاد ہے۔ (کثرھم اللہ داعانھم) پھلواری صاحب کو کم از کم اس حدیث کے اس لفظ کو تو دیکھنا تھا۔ فان غم علیکم فاکملو العدۃ ثلثین۔ اس لئے کہ اگر رویت کے معنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا نہیں بلکہ چاند ہو جانے کا علم و یقین ہے تو پھر اس میں غمام و غبار کا کیا سوال ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ گرد و غبار یا بادل، تو رویت بصری ہی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، نہ کہ جدید سائنسی آلات کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم و یقین پر۔

(مولانا لطافت الرحمان۔ بہاولپور)

احوال و کوائف دار العلوم حقانیہ

نتیجہ امتحانات شرکاء دورۂ حدیث ۱۳۸۸ھ دار العلوم حقانیہ ملحقہ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

وفاق المدارس کے زیر نگرانی دار العلوم حقانیہ کے دورۂ حدیث کے امتحانات میں کامیاب طلبہ کا نتیجہ درج ذیل ہے۔ دار العلوم حقانیہ کے طلباء دورۂ حدیث میں سے ایک سو آٹھ افراد امتحان میں شریک ہوئے، ان میں سے مولوی اللہ نور بن شیرین دل افغانستانی کل ۶۰۰ نمبرات میں سے ۴۵۴ نمبر لیکر پورے پاکستان کے مدارس میں اول آئے۔ کامیاب طلبہ میں رول نمبرات ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۳۰، ۴۱، ۴۵، ۴۹، ۷۱، ۷۴ کو ترمذی شریف اور ۷۹ کو بخاری شریف میں ضمنی امتحان دینا ہوگا۔ کل نمبرات ۶۰۰ ہیں، ۳۶۰ یا اس سے زائد درجۂ علیا، ۳۰۰ یا اس سے زائد درجۂ وسطیٰ، ۲۴۰ یا اس سے زائد درجۂ ادنیٰ میں کامیاب ہیں۔

(ادارہ)

نمبر شمار	اسمائے فضلاء	حاصل کردہ نمبرات	نمبر شمار	اسمائے فضلاء	حاصل کردہ نمبرات
۱	مولوی عبد الرحیم بن عبد الحکیم مردانی	۳۱۹	۷	مولوی محمد عثمان کیمبلپوری	۳۱۰
۲	〃 فضل قادر بن فضل وہاب	۳۱۳	۸	〃 احسان اللہ سواتی	۲۸۶
۳	〃 شاہ محمود بن صاحب جان	۲۸۲	۹	〃 عبد القدیر افغانی	۳۲۱
۴	〃 گل رحمان بن عبد الرحیم	۳۳۴	۱۰	〃 محمود وزیرستانی	۲۵۷
۵	〃 نور الحق بن نور احمد مردانی	۲۸۸	۱۱	〃 خلیل الرحمان مردانی	۳۴۰
۶	〃 محب اللہ بن قاسم جان	۲۷۶	۱۲	〃 غورشت خان	۴۰۹

نمبر شمار	اسمائے فضلاء	حاصل کردہ نمبرات
۱۳	مولوی عبدالواحد بن عبدالرشید	۳۲۸
۱۴	" فاتح محمود دیدوی	۳۴۴
۱۵	" اللہ نور افغانی	۴۵۴
۱۶	" ارشاد احمد بن عبدالخالق	۳۲۶
۱۷	" محمد اشرف بن نثار احمد	۴۰۳
۱۸	" محمد شریف بن محمد زمان	۲۴۹
۱۹	" سید محمد نور بلوچستانی	۲۲۷
۲۰	" محمد رسول وزیری	۲۸۱
۲۱	" عبداللہ بن نعمت اللہ	۲۴۵
۲۲	" رحیم داد بن صاحب الحق	۲۷۷
۲۳	" محمد حنیف ولد آغا محمد	۳۱۷
۲۴	" محمد ایوب بن پیر محمد	۲۴۳
۲۵	" بسم اللہ بن فصیح اللہ	۲۸۱
۲۶	" عبدالرؤف بن عبدالرحیم	۲۴۲
۲۷	" محمد لائق بن محمد فقیر	۲۹۳
۲۸	" غلام محی الدین بن عبدالرؤف	۲۸۳
۲۹	" محمد طاہر بن عبدالحلیم	۲۴۰
۳۰	" محمد نادر بن محمد عظیم	۲۸۷
۳۱	" گل زرین بن شیرین	۳۰۳
۳۲	" عبدالمنان بن جاناں	۲۸۹
۳۳	" عبدالحمید بن سید محمد	۳۰۸
۳۴	" مولوی ولی داد بن گلداد	۲۹۲
۳۵	" حسین احمد بن عبدالحمید	۳۳۷
۳۶	مولوی شبیر احمد بن سعداللہ	۳۶۰
۳۷	" عزیزالرحمٰن بن جمعہ دین	۲۴۷
۳۸	" گل روز بن محمد روز	۲۴۰
۳۹	" فضل کریم بن ملا میاں خان	۲۶۲
۴۰	" عبیداللہ بن عبداللہ	۳۵۶
۴۱	" رضوان اللہ بن میر گل	۲۸۱
۴۲	" محمد ایوب بن نور احمد	۲۹۹
۴۳	" رحمت جلال بن سید جلال	۲۷۰
۴۴	" عبدالواحد بن پائندہ محمد	۲۸۶
۴۵	" رسول حبیب بن لعل حبیب	۳۱۲
۴۶	" متوکل بن عبدالمجید	۳۳۸
۴۷	" بحرالحق بن عبدالقیوم	۳۲۴
۴۸	" محمد اللہ بن عاشور خان	۳۵۶
۴۹	" عبدالحکیم بن عبدالستار	۲۷۹
۵۰	" غلام حبیب بن اشرف الدین	۲۷۳
۵۱	" عبدالرب بن بلند خان	۲۵۸
۵۲	" عبدالوہاب بن شمشیر خان	۳۱۰
۵۳	" عبدالباری بن پائندہ خان	۳۰۵
۵۴	" خواجہ میر حیدر بن بادچاہ	۳۲۷
۵۵	" محمد عبدالحی بن بدرالدین	۳۰۵
۵۶	" نور محمد بن گل محمد	۲۶۲
۵۷	" عبدالرحمان بن سلیم خان	۲۵۵
۵۸	" عبدالستار بن عبدالجبار	۳۴۳

نمبر شمار	اسمائے فضلاء	حاصل کردہ نمبرات
۵۹	مولوی الف خان بن صاحب گل	۳۳۵
۶۰	" گل رحمن بن رحمت ولی	۲۶۵
۶۱	" نور علی بن رند علی	۲۴۲
۶۲	" نور الحق بن عبد الحق	۳۲۴
۶۳	" محمد عالم بن محمد اکبر علی	۳۳۳
۶۴	" محمد زیب بن محی الدین	۲۴۵
۶۵	" ریحان الدین بن عبد الرزاق	۳۳۲
۶۶	" فضل معبود بن سید محمود	۳۲۹
۶۷	" غلام حبیب بن محمد غفور	۳۳۴
۶۸	" عبد الرحمن بن عبد اللہ	۳۳۵
۶۹	" محمد سلیم بن محمد یٰسین	۳۲۰
۷۰	" سعید اللہ بن عبد اللہ	۳۲۸
۷۱	" عبد الاحد بن محمد زرین	۲۸۰
۷۲	" محمد نبی بن امیر گل	۲۵۸
۷۳	" ہستی خان بن قلال خان	۲۸۷
۷۴	" عبد المالک بن طالب دین	۲۴۵
۷۵	" گل زار بن آدم خان	۲۴۹
۷۶	" عبد الرحمن بن محب اللہ	۲۶۰
۷۷	" فضل مالک بن سلطان محمد	۲۶۴
۷۸	" قیام الدین بن معتدین	۲۶۰
۷۹	" پائندہ گل بن محمد علی	۲۵۷
۸۰	" جان ولی بن خالد	۲۸۲
۸۱	" فیض محمد بن اذان اللہ	۲۸۸
۸۲	مولوی مطیع الحق بن واحد رسول	۲۹۷
۸۳	" عبد الباعث بن زیارت گل	۳۷۹
۸۴	" فضل رحیم بن عبد الرحیم	۲۴۲
۸۵	" مخزن العلوم بن بحر العلوم	۳۶۵
۸۶	" عبد الغفور بن عبد الرحمن	۴۰۶
۸۷	" احمد بن نصیر الدین	۳۰۹
۸۸	" محمد سلیمان بن سلطان	۲۸۴
۸۹	" شہزادہ گل بن رحیم جان	۳۴۲
۹۰	" تاج محمد بن رحمت اللہ	۲۸۰
۹۱	" حفیظ الرحمن بن حبیب الرحمان	۳۵۵
۹۲	" عبد البصیر بن صفر محمد	۳۳۰
۹۳	" عبد المتین بن وزیر محمد	۳۶۰
۹۴	" فضل میر بن طالب جان	۳۵۳

★

کامیاب طلبا ضمنی بخاری ۱۳۸۸ھ

نمبر شمار	اسمائے فضلاء	حاصل کردہ نمبرات
۹۵	مولوی مطیع الحق بن سراج الدین	۴۰
۹۶	" جہان نور بن سید اسلم	۴۰
۹۷	" گل کریم بن فضل کریم	۵۱

★